جلد ۱۱ شمارہ ۶ جون ۱۹۹۹ء صفر ۱۴۲۰ھ

فہرست

اس شمارے میں

اس شمارے میں | محمد بلال | ۲

شذرات

کوسووا میں ظلم | محمد بلال | ۴

قرآنیات

البیان: البقرہ ۲: ۳۴-۳۹ (۸) | جاوید احمد غامدی | ۸

معارف نبوی

اللہ کا حق | طالب محسن | ۱۳

دین و دانش

اصول و مبادی (۱۲) | جاوید احمد غامدی | ۱۹

قانونِ دعوت (۳) | جاوید احمد غامدی | ۲۵

التزام جماعت ـــــ اعتراضات کا جائزہ (۶) | معز امجد | ۴۲

اللہ کہاں ہے؟ | معز امجد / محمد بلال | ۵۶

دانش سرا کی سرگرمیاں

دانش سرا، پاکستان کا دوسرا سالانہ اجتماع (۲) | محمد بلال | ۶۳

ادبیات

شکایت (افسانہ) | محمد بلال | ۷۰

جرم ضعیفی (نظم) | جاوید احمد غامدی | ۷۲

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اس شمارے میں

وہ بزرگ بہت پریشان تھے۔ان کی حالت قابلِ رحم تھی۔انھوں نے بتایا کہ میرے گھریلو مسائل ایسے ہیں کہ میں کسی مذہبی ''جماعت'' کا رکن نہیں بن سکتا۔ اس رکنیت کے تقاضے پورے نہیں کر سکتا۔ لیکن اس بزرگ کو یہ تشویش بھی تھی کہ اگر انھوں نے کسی ''جماعت'' کے ساتھ وابستگی اختیار نہ کی تو وہ جاہلیت کی موت مریں گے۔ وہ بزرگ جن صاحب سے عربی پڑھتے اور جن کا درسِ قرآن سنتے تھے انھوں نے ان پر یہ حدیث واضح کر دی تھی کہ جو شخص ''جماعت'' سے وابستہ ہوئے بغیر مر گیا، وہ جاہلیت یعنی کفر کی موت مرے گا۔اور انھیں یہ بھی بتادیا تھا کہ ہماری ایک ''جماعت'' ہے۔اس کا ایک امیر ہے۔ وہ سمع و طاعت کی بیعت لیتا ہے۔ہم نے اس کی بیعت کر رکھی ہے۔اور اپنی جماعت کا رکنیت فارم بھی انھیں دے دیا تھا۔

میں نے اس بزرگ کو تسلی دی اور انھیں کہا کہ آپ جاہلیت کی موت نہیں مریں گے۔اس لیے کہ آپ ''جماعت'' کے ساتھ وابستہ ہیں اور اس کے تحت ہی زندگی گزار رہے ہیں حتیٰ کہ اس ''جماعت'' کے امیر کی اطاعت بھی کر رہے ہیں۔

میری بات سن کر وہ بزرگ بہت حیران ہوئے۔ میں نے اپنی بات کی مزید وضاحت کی اور دوسرے دن ''اشراق'' کے وہ شمارے جن میں ''التزامِ جماعت'' کی بحثیں شائع ہوئی تھیں، ان تک پہنچا دیے۔

کچھ دنوں کے بعد وہ بزرگ میرے سامنے شکر گزاری کا اظہار کر رہے تھے۔

التزامِ جماعت کے متعلق احادیثِ نبوی کے بارے میں ہمارے ہاں بہت غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں جس کی وجہ سے گوناگوں مسائل پیدا ہو رہے ہیں اور کل مزید سنگین مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔ ہماری یہ کوشش ہے کہ اس معاملے میں ہر غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی جائے، لہٰذا اس شمارے میں ''دین و دانش'' کے ذیل میں معز امجد صاحب نے ''التزامِ جماعت ـــــ اعتراضات کا جائزہ'' کے زیرِ عنوان مذکورہ مسئلے کے متعلق چند مزید غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے۔ اگرچہ یہ بحث بہت طویل ہو چکی ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہ بحث بہت ضروری ہے۔ وہ لوگ جو اس مسئلے میں پہلے سے واضح ہیں ان سے ہماری درخواست ہے کہ وہ ایسی تحریروں کا تنقیدی نقطۂ نگاہ

سے مطالعہ کریں اور اس ضمن میں ہمارے کام میں کوئی خامی پائیں تو ہماری توجہ اس جانب مبذول کرائیں۔ یہ چیز مسئلے کی تنقیح کرنے میں بہت مفید ثابت ہو گی۔

ہمارے معاشرے میں ایک غلط فہمی یہ بھی پائی جاتی ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دینِ اسلام کے بانی ہیں اور اسلام سے قبل عرب میں انبیا کے دین کے کوئی آثار موجود نہیں تھے۔ اس وقت ''دین و دانش'' ہی کے ذیل میں ''اصول و مبادی'' کے زیرِ عنوان جاوید احمد صاحب غامدی کی تحریر شائع کی گئی ہے۔ یہ تحریر اس غلط فہمی کو بھی دور کرے گی۔

دورِ حاضر میں مستشرقین نے انٹرنیٹ کے ذریعے سے بھی اسلام پر اعتراضات کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ ہمارا جدید پڑھا لکھا طبقہ مغرب سے پہلے ہی بہت مرعوب ہے اس لیے مستشرقین کے ان اعتراضات سے وہ بہت جلد منفی طور پر متاثر ہو جاتا ہے اور تشکیک اور الحاد کی راہ پر چل پڑتا ہے۔ لہٰذا ان اعتراضات کا جواب دینا بہت ضروری ہے۔ معز امجد صاحب پچھلے دو سال سے یہ کام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن ان کا یہ کام انگریزی زبان میں ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ معز صاحب کے اس تمام کام کا قارئینِ ''اشراق'' کے لیے اردو میں ترجمہ کیا جائے۔ فی الحال ایسی ایک تحریر کا ترجمہ اس وقت شائع کیا گیا ہے۔

''ملاقات'' کے ضمن میں احمد جاوید صاحب کے انٹرویو کا دوسرا حصہ اس وقت شائع نہیں کیا گیا۔ دراصل احمد جاوید صاحب کے ساتھ بروقت ملاقات کا اہتمام نہ ہو سکا۔ ان شاء اللہ اگلے شمارے میں یہ انٹرویو مکمل ہو جائے گا۔

''شذرات''، ''قرآنیات''، ''معارفِ نبوی''، ''دانش سرا کی سرگرمیاں'' اور ''ادبیات'' کے سلسلے حسبِ سابق موجود ہیں۔

—— محمد بلال

www.javedahmadghamidi.org

کوسووا میں ظلم

ساتویں صدی عیسوی کا آخری عشرہ تھا۔ گاتھ نامی ایک قوم کی اندلس (موجودہ اسپین) پر حکومت تھی۔ حکمران کا نام وٹیزا تھا۔ اس وقت وہاں پادریوں کا بہت اثر ورسوخ تھا۔ وہ لوگوں کو بہت ستاتے تھے اور خاص طور پر یہودیوں پر بہت ظلم کرتے تھے۔ وٹیزا نے پادریوں کی قوت ختم کرنے کی کوشش کی مگر پادریوں نے یہ پروپیگنڈا کر دیا کہ وٹیزا یہودیوں کا خیر خواہ ہے۔ یہودیوں کی خیر خواہی ایک ناقابل معافی جرم تھا۔ لٰہذا پادریوں کو وٹیزا کو معزول کرنے میں زیادہ دقت نہ ہوئی۔ اس طرح پادریوں نے اپنے پسندیدہ ایک فوجی سردار لرزیق (راڈرک) کو تخت نشیں کر کے لوگوں پر مسلط کر دیا۔ لٰہذا پادریوں کی قوت اور حرکتوں میں کوئی فرق نہ آیا۔

جولین وٹیزا کا داماد تھا۔ لرزیق نے جولین کی جوان بیٹی کی عصمت دری کر ڈالی جس پر جولین طیش میں آگیا۔ لیکن اس نے ظلم کی تلافی کے لیے عقل وبصیرت سے کام لیا۔

موسیٰ بن نصیر، خلیفہ ولید بن عبدالملک کی طرف سے مغربی ممالک کا وائسرائے تھا جس کا قیام قیروان میں تھا۔ جولین چند عیسائی سرداروں کے ہمراہ قیروان پہنچا۔ موسیٰ بن نصیر سے ملاقات کی۔ موسیٰ اس عیسائی وفد کو عزت وتکریم سے ملا۔ جولین اور اس کے وفد نے موسیٰ سے کہا: حکومتِ اندلس عوام پر ظلم کر رہی ہے۔ آپ عوام کو اس ظلم سے نجات دلائیں۔ آپ کے سوا دنیا میں کوئی طاقت ایسی نہیں ہے جس کے پاس ہم اپنی فریاد لے کر جائیں۔

موسیٰ نے خلیفہ ولید کی اجازت سے جولین کے بیان کی تصدیق حاصل کی۔ پھر اس نے اپنے ایک بہادر اور قابل گورنر طارق بن زیاد کو اندلس پر چڑھائی کرنے کا حکم دیا۔ طارق نے حکم کی تعمیل کی۔ طارق کے پاس بارہ

ہزار اور لرزیق کے پاس ایک لاکھ کا لشکر تھا۔ جنگ شروع ہوئی۔ بارہ ہزار ایک لاکھ پر غالب آئے۔ اس طرح ایک ظلم کا خاتمہ ہوا۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب مسلمان ایمانی اور مادی قوت کے حامل تھے۔ وہ ایک تھے۔ وہ ملکوں، فرقوں اور طبقوں میں بٹے ہوئے نہیں تھے۔ وہ موت سے ڈرے ہوئے نہیں تھے۔ وہ ذوقِ شہادت سے عاری نہیں تھے۔

آج کوسووا[1] (Kosovo) میں لرزیق کے اندلس سے بڑھ کر ظلم ہو رہا ہے۔ لیکن اِس وقت مسلمان ایمانی

۱۔ کوسووا کے مسئلے کی مختصر تاریخ یہ ہے۔ ۱۳۸۹ء میں سلطنتِ عثمانیہ نے سربوں کو شکست دی۔ کوسووا عثمانیوں کے تحت آگیا۔ اس طرح یہاں اسلام آیا۔ اور پھر اس خطے اور اس کے گردو پیش میں اسلام پھیلا۔

۱۹۱۳ء کی جنگ بلقان کے نتیجے میں یہاں ترکی کا اثر کم ہو گیا۔ سربوں کا اثر بڑھ گیا اور بلقان کے علاقے چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی صورت میں خود مختار ہو گئے۔ ۱۹۲۹ء میں کوسووا یوگوسلاویہ کی فیڈریشن کا خود مختار حصہ بنا دیا گیا۔ یوگوسلاویہ مشرقی یورپ کا خوش حال اور پر امن ملک تھا۔ اس کے مغرب اور سوویت بلاک، دونوں کے ساتھ اچھے تعلقات تھے۔ ۱۹۹۰ء میں یوگوسلاویہ سوویت یونین کی طرح شکست وریخت کا شکار ہوا۔ اسی سال سربیا کے صدر ملاسووک (Milosevic) نے جو پہلے سربین کیمونسٹ پارٹی کا سربراہ تھا، عظیم تر سربیا (Greater Serbia) بنانے کے پیشِ نظر منتخب ادارے توڑنے اور ان کی خود مختاری ختم کرنے کا یکطرفہ اعلان کر دیا۔ کوسووا کے باشندوں نے یہ آمرانہ فیصلہ تسلیم نہ کیا۔ ۱۹۹۲ء میں کوسووا میں ریفرنڈم ہوا۔ کوسووا میں ۹۰ فی صد البانوی نژاد مسلمان اور ۹ فی صد سرب تھے۔ ریفرنڈم کا نتیجہ نکلا۔ ۹۹ فی صد آبادی کی حمایت سے آزاد جمہوریہ کوسووا کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔ ۱۹۹۸ء میں یہاں دوبارہ الیکشن ہوئے اور ابراہیم روگروا صدر منتخب کر لیے گئے، مگر عیسائی اکثریت کا حامل سربیا کوسووا کی آزادی کی راہ میں حائل ہو گیا ——— سربیا اسی طرح بوسنیا کی آزادی کی راہ میں بھی حائل ہوا تھا لیکن بوسنیا بالآخر آزاد ہو گیا تھا ——— اور کوسووا کے ریفرنڈم اور الیکشن کو رد کر دیا۔ پھر کوسووا پر اپنی مسلح افواج کے ذریعے سے ظلم و ستم، عصمت دری اور قتل و غارت کا سلسلہ شروع کر دیا۔ لاکھوں مسلمانوں کو زبردستی وہاں سے نکال کر انھیں جلاوطنی اور خانہ بدوشی کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا اور خود کوسووا پر قبضہ کر لیا۔

سربوں کا یہ کہنا ہے کہ کوسووا سربیا کا اٹوٹ انگ ہے۔ آج سے چھ سو سال پہلے مسلمان یہاں باہر سے آئے تھے، اس

اور مادی قوت کے حامل نہیں ہیں۔ وہ ایک نہیں ہیں۔ وہ ملکوں، فرقوں اور طبقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ وہ موت سے خائف ہیں۔ ذوقِ شہادت سے عاری ہیں۔ وہ کسی ''موسی بن نصیر'' سے محروم ہیں۔

کوسووا میں ظلم کی تلافی کا آئیڈیل حل کیا تھا؟ اس کا آئیڈیل حل یہ تھا کہ اسلامی ممالک کی حکومتیں ایک ہو جاتیں۔ وہ سربیا کو ظلم سے باز رکھنے کے لیے سفارتی ذرائع بروے کار لاتیں۔ مناسب مہلت پوری ہو جانے کے بعد جہاد و قتال کا اعلان کرتیں۔ وہ ''موسیٰ بن نصیر'' بن جاتیں اور کسی ''طارق بن زیاد'' کو سربوں پر چڑھائی کا حکم دیتیں۔ اول تو فوجی قوت اور مالی وسائل کی کمی کا مسئلہ درپیش نہ ہوتا لیکن بالفرض ایسی صورتِ حال پیدا ہو بھی جاتی تو اس کے لیے وہ عام مسلمانوں سے اپیل کرتیں۔ اس صورت میں ہم بھی قلم چھوڑ کر خود کو پیش کر دیتے۔ آسمان سے اللہ کی مدد زمین پر اترتی۔ پھر کوسووا پر فضائی اور زمینی حملے کیے جاتے اور سربوں کو کوسووا کی سرحدوں سے دھکیل کر انھیں ان کی حدود سے آشنا کر دیا جاتا بلکہ مونٹی نیگرو[۲] کے مظلوموں کو بھی سرب درندگی سے نجات دلانے کی کوشش کی جاتی۔

لیکن مسلمان اس وقت دنیا میں پستی کے مقام پر ہیں۔ وہ کسی غیر مسلم پر ظلم کی تلافی تو دور کی بات کسی مسلمان پر ظلم رکوانے کی پوزیشن میں بھی نہیں ہیں۔ وہ نیٹو کی افواج پر تنقید کر رہے ہیں۔ ان کے کوسووا میں زمینی اقدام نہ کرنے پر گلہ کر رہے ہیں۔ یوگوسلاویہ پر عراق کے مقابلے میں ان کی کم اور نشانے سے ہٹی ہوئی بمباری پر شکوہ کر رہے ہیں۔ مغربی ممالک کی مسلم دوستی میں سے مسلم دشمنی آشکار کر رہے ہیں۔ گہرائی کے ساتھ سوچیں تو یہ گلے اور شکوے دراصل ہماری پستی اور کمزوری ہی کی علامت ہیں۔ مسلمان یہ کیوں نہیں سوچتے کہ کوسووا ان کا مسئلہ ہے، اسے انھیں ہی حل کرنا چاہیے تھا۔

لیے یہ خطۂ ارضی ان کا نہیں ہمارا ہے مسلمانوں کو یہاں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے، حالانکہ اس اصول پر امریکہ بھی سفید فام امریکیوں کا نہیں ہے اور سرب بھی سربیا میں ہمیشہ سے نہیں رہ رہے۔ کوسووا کے مسلمان کئی نسلوں سے یہاں آباد ہیں اور یہ بھی واقعہ ہے کہ اسلام یہاں کے مقامی لوگوں نے بڑی تعداد میں قبول کیا۔ اس لیے عدل وانصاف کا تقاضا ہے کہ یہ کوسووا کے باشندوں پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ ایک خود مختار صوبے کی حیثیت سے البانیہ کے ساتھ فیڈریشن بنانا چاہتے ہیں یا سربیا کے ساتھ۔

۲۔ یہ بھی یوگوسلاویہ کی ایک ریاست ہے۔ اس کے باشندے بھی سربوں کے ظلم وستم کا شکار ہیں۔

سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کی اس پستی کی وجہ کیا ہے؟اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان خود اس وقت اپنے اوپر ظلم کر رہے ہیں۔ وہ آخرت پر دنیا کو ترجیح دے کر ظلم کر رہے ہیں۔ وہ دین کو زندگی میں اس کا اصل مقام نہ دے کر اپنے اوپر ظلم کر رہے ہیں۔ وہ علم و ہنر کے ماہرین اور اخلاقی مصلحین پر فنکاروں اور کھلاڑیوں کو فوقیت دے کر اپنے اوپر ظلم کر رہے ہیں۔ وہ خود کو ملکوں، فرقوں اور طبقوں میں تقسیم کر کے خود پر ظلم کر رہے ہیں۔ جب تک یہ اپنے اوپر ظلم بند نہیں کریں گے، اغیار بھی ان کے اوپر ظلم بند نہیں کریں گے۔

یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ شیاطینِ جن وانس کو قیامت تک اپنا کام کرنے کی مہلت حاصل ہے۔ اس لیے دنیا میں کوسووا جیسے ظلم کا ارتکاب ہوتا رہنا ہے۔ اس ظلم کے خاتمے کا صحیح اور باوقار حل یہ ہے کہ مسلمان اپنے اوپر ظلم کرنا بند کریں اور میدانِ عمل میں اتریں، ورنہ کشمیر، فلسطین اور کوسووا جیسے مسائل جنم لیتے ہی رہیں گے۔

—— محمد بلال

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ البقرۃ

(۸)

(گذشتہ سے پیوستہ)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ ط اَبٰی وَاسْتَکْبَرَ

اور[۸۱] یاد کرو جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو[۸۲] تو وہ سجدہ ریز ہو گئے، لیکن

۸۱۔ اصل الفاظ ہیں: 'واذ قلنا'۔ آیت ۳۰ کی ابتدا میں پہلے 'اذ' کے بعد یہ دوسرا 'اذ' اس بات کا واضح قرینہ ہے کہ یہ ایک مستقل واقعہ ہے، لہٰذا ضروری نہیں کہ یہ پہلے واقعے کے بعد ہی پیش آیا ہو۔

۸۲۔ یہ سجدۂ تعظیمی تھا اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوا، اس لیے اس میں شرک کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی اطاعت کا یہ امتحان جس وجہ سے لیا، وہ یہ تھی کہ اولاً، آدم پر واضح ہو جائے کہ اصلی سرفرازی نور یا نار سے پیدا ہونے میں نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری میں ہے، لہٰذا اسے بھی اپنی انانیت کو ایک طرف رکھ کر ہمیشہ حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا چاہیے۔ ثانیاً وہ یہ سمجھ لے کہ اُسے جب اللہ تعالیٰ نے یہ درجہ دیا ہے کہ فرشتوں نے اس کو سجدہ کیا تو یہ بات کسی طرح اس کے شایانِ شان نہیں ہے کہ وہ کسی برتر سے برتر مخلوق کو بھی خدا کا شریک سمجھ کر اس کی پرستش کرے۔ بندگی اور پرستش اللہ تعالیٰ ہی کا حق ہے، وہ اگر اس حق میں کسی کو شریک کرتا ہے تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کی اہانت نہیں کرتا، بلکہ خود اپنی بھی اہانت کرتا ہے۔

وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٣٤﴾ وَقُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا
مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۠ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٣٥﴾

ابلیس [83] نہیں مانا [84]۔ اُس نے انکار کیا اور اکڑ بیٹھا اور اِس طرح منکروں میں شامل ہوا۔ اور ہم نے آدم سے کہا: تم اور تمھاری بیوی، دونوں اِس [85] باغ میں رہو اور اِس میں سے جہاں سے چاہو، فراغت کے ساتھ کھاؤ۔ ہاں، البتہ تم دونوں اِس درخت [86] کے پاس نہ جانا ورنہ ظالم قرار

اس سلسلۂ بیان میں یہ واقعہ اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ بنی اسرائیل بھی اس کی روشنی میں یہ فیصلہ کر سکیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں وہ فرشتوں کی روش اختیار کرنا چاہتے ہیں یا ابلیس کی جس نے حسد اور تکبر کی بنا پر آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔

۸۳۔ یہ 'ابلس' سے 'افعیل' کے وزن پر اُس جن کا لقب ہے جس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا۔ 'ابلس' کے معنی مایوس اور غم زدہ ہونے کے ہیں۔ بعض لوگ اسے فرشتہ سمجھتے ہیں، لیکن قرآن میں صراحت ہے کہ یہ جنات میں سے تھا۔

۸۴۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنات چونکہ اپنی خلقت کے لحاظ سے فرشتوں سے زیادہ دور نہیں ہیں، اس لیے انھیں جب سجدہ کا حکم دیا گیا تو علی سبیل التغلیب جنات بھی اس حکم میں شامل تھے۔

۸۵۔ یہ غالباً اسی دنیا کا کوئی باغ تھا جسے آدم و حوا کا مستقر قرار دیا گیا۔ اس میں جو امتحان انھیں پیش آیا، اس سے دونوں پر یہ بات واضح ہوگئی کہ شیطان ان پر حملہ کرے گا تو کہاں سے کرے گا۔

۸۶۔ سورۂ طٰہٰ (۲۰) کی آیت ۱۲۰ میں اسے 'شجرة الخلد' کہا گیا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ لفظ 'الشجرة' یہاں مجازی مفہوم میں ہے۔ 'شجرة الخلد' کے لفظ سے جو معنی متبادر ہوتے ہیں اور اس درخت کا پھل کھانے کے جو اثرات قرآن کے دوسرے مقامات پر بیان ہوئے ہیں، دونوں اس بات کی طرف صاف اشارہ کرتے ہیں کہ اس سے مراد وہی شجرۂ تناسل ہے جس کا پھل کھانے ہی سے انسان اس دنیا میں اپنے آپ کو باقی رکھے ہوئے ہے، لیکن آج بھی دنیا میں اس کے لیے سب سے بڑی آزمایش اگر کوئی ہے تو یہی درخت ہے۔ سورۂ اعراف (۷) کی آیت ۲۷ سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان سب سے بڑھ کر اسی کو فتنے کا ذریعہ بناتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے میاں بیوی کو ایک دوسرے کے لیے لباس قرار دیا اور انھیں اجازت دی کہ وہ یہ لباس

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيۡطٰنُ عَنۡهَا فَاَخۡرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيۡهِ ۖ وَقُلۡنَا اهۡبِطُوۡا بَعۡضُكُمۡ
لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمۡ فِى الۡاَرۡضِ مُسۡتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيۡنٍ ﴿۳۶﴾ فَتَلَقّٰٓى
اٰدَمُ مِنۡ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيۡهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيۡمُ ﴿۳۷﴾ قُلۡنَا اهۡبِطُوۡا

پاؤ گے۔ پھر شیطان[۸۷] نے اُن کو وہاں سے پھسلا دیا[۸۸] اور جس حالت میں وہ تھے، اُس سے اُنھیں نکلوا کر چھوڑا۔ اور ہم نے کہا: یہاں سے اتر جاؤ[۸۹]۔ اب تم ایک دوسرے کے دشمن ہو[۹۰] اور تمھیں ایک خاص وقت تک زمین پر ٹھیرنا ہے اور وہیں گزر بسر کرنی ہے۔ پھر آدم نے اپنے پروردگار سے (توبہ کے) چند الفاظ سیکھ لیے[۹۱] (اور اُن کے ذریعے سے توبہ کی[۹۲]) تو اُس کی توبہ اُس نے قبول کر لی[۹۳]۔

پہن کر اس درخت کا پھل کھائیں، لیکن شیطان ہمیشہ اُنھیں اس لباس کے بغیر ہی اس کا پھل کھانے کی ترغیب دیتا رہتا ہے۔

۸۷۔ اس سے مراد وہی ابلیس ہے جس کا ذکر اوپر کی آیات میں ہوا ہے۔

۸۸۔ اس نے آدم و حوا سے کہا کہ حیاتِ جاوداں اور ابدی بادشاہی کا راز اسی درخت کے پھل میں ہے جس سے تمھیں محروم کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس ترغیب سے وہ اس پھل کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کی خواہش میں جو غیر معمولی کیفیت انسان پر طاری ہو جاتی ہے، اس سے مغلوب ہو کر شیطان کے فریب میں آ گئے اور یہ پھل کھا بیٹھے۔

۸۹۔ اصل میں لفظ 'اھبطوا' استعمال ہوا ہے۔ اس میں 'اترو' کا مفہوم وہی ہے جو اسی سورہ کی آیت ۶۱ کے الفاظ 'اھبطوا مصراً' میں ہے۔ یعنی اے آدم و حوا اور ابلیس، تم سب اس باغ سے نکل کر زمین میں اتر جاؤ۔

۹۰۔ یعنی ابلیس تمھارا دشمن ہے اور تم اس کے دشمن ہو۔ تمھارے اور اس کے درمیان فطری تعلق دشمنی ہی کا ہے، لٰہذا تم کو ہمیشہ اسے اپنا دشمن ہی سمجھنا چاہیے۔

۹۱۔ اس سے اللہ تعالیٰ کی سنت معلوم ہوتی ہے کہ انسان جب گناہ کر لینے کے بعد ندامت اور شرمندگی کے ساتھ اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو وہ نہ صرف یہ کہ اسے توبہ کی توفیق دیتا ہے، بلکہ اس کے لیے

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

مِنۡهَا جَمِيۡعًا ۚ فَاِمَّا يَاۡتِيَنَّكُمۡ مِّنِّىۡ هُدًى فَمَنۡ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوۡفٌ
عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَكَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓـئِكَ

وہ بے شک، بڑا معاف فرمانے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ ہم نے کہا: تم سب یہاں سے اتر جاؤ[۹۴]، پھر میری طرف سے اگر کوئی ہدایت تمھارے پاس آئے[۹۵] تو (یادرکھو کہ تم میں سے) جو لوگ میری اِس ہدایت کی پیروی کریں گے، (اُن کا صلہ جنت ہے)، اُنھیں (وہاں) کوئی خوف ہو گا اور نہ

موزوں الفاظ بھی اس کے دل میں ڈال دیتا ہے۔ آدم علیہ السلام کو جو الفاظ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے سکھائے، وہ سورۂ اعراف (۷) کی آیت ۲۳ میں بیان ہوئے ہیں۔

۹۲۔ اس لیے کہ انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے کوئی مجرم نہیں ہے۔ وہ اگر گناہ کرتا ہے تو اس وجہ سے نہیں کرتا کہ وہ ازلی گنہ گار ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ارادہ و اختیار کی جو نعمت اسے عطا فرمائی ہے، اس کے سوء استعمال کی وجہ سے گناہ کرتا ہے۔ اس گناہ سے اپنے آپ کو پاک کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے توبہ و اصلاح کا طریقہ اسے بتایا ہے، اس کے لیے کفارے کا کوئی عقیدہ وضع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

۹۳۔ اصل الفاظ ہیں: 'فتاب علیه'۔ اس میں 'علی' اس بات پر دلیل ہے کہ یہ 'اقبل' کے مفہوم پر متضمن ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا التفات اور توجہ اسے پھر حاصل ہو گئی۔ یہ رحمت و عنایت کا مضمون ہے جسے 'انه هو التواب الرحیم' کے الفاظ میں قرآن نے واضح کر دیا ہے۔

۹۴۔ یہ الفاظ دو مرتبہ دہرائے گئے ہیں۔ ایک مرتبہ آدم علیہ السلام کی لغزش کا ذکر کرنے کے بعد اور دوسری مرتبہ یہاں اُن کی توبہ کے بعد۔ لغزش کے بعد یہ اُس لغزش کا نتیجہ بیان کرنے کے لیے آئے ہیں اور توبہ کے بعد اس بات کو واضح کرنے کے لیے کہ یہی امتحان اب تمھیں دنیا میں درپیش ہے، اس کے لیے جاؤ، تمھاری لغزش اور توبہ سے وہ مقصد پورا ہو گیا جس کے لیے تم اس باغ میں رکھے گئے تھے۔ تمھارا مستقر اب دنیا ہے اور تمھیں ایک خاص وقت تک اسی میں رہنا ہے۔

۹۵۔ یعنی تم جس امتحان میں ڈالے گئے ہو، وہ بڑا سخت امتحان ہے۔ اس میں تنہا اپنی عقل و فطرت کی رہنمائی سے تمھیں کامیابی میں مشکل ہو سکتی ہے۔ میری رحمت کا تقاضا ہے کہ اس میں تمھاری ہدایت کا سامان کروں، لہٰذا میں یہ سامان کروں گا تاکہ جس نے ہدایت پائی ہے وہ ہدایت پائے اور جس نے گمراہی کے راستے پر چلنا ہے، وہ پوری طرح اتمامِ حجت کے بعد چلے اور جزا و سزا کے دن اپنا کوئی عذر پیش نہ کر سکے۔

اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۳۹﴾

وہ (کبھی) غم زدہ ہوں گے[96]، اور جنھوں نے اِس کا انکار کیا، اور ہماری آیتوں کو جھٹلا دیا، وہ دوزخ والے ہیں، وہ ہمیشہ اُسی میں رہیں گے۔ ۳۴-۳۹

۹۶۔ قرآنِ مجید میں یہ الفاظ جنت کی تعبیر کے لیے خاص ہیں۔ یعنی ایسی جگہ جہاں نہ مستقبل کا کوئی اندیشہ ہو گا اور نہ ماضی کا کوئی پچھتاوا۔ 'خوف' اور 'حزن' کے جو الفاظ اصل میں آئے ہیں، وہ اسی مفہوم پر دلالت کرتے ہیں، اس لیے کہ خوف کسی پیش آنے والے خطرے کا ہوتا ہے اور حزن رفتہ و حاضر کے کسی نقصان کا۔ دنیا کی زندگی، اس کے برعکس، اگر دیکھیے تو مستقبل کے اندیشوں اور ماضی کے پچھتاووں ہی کا نام ہے۔

[باقی]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

طالب محسن

اللہ کا حق

(مشکوٰۃ المصابیح، حدیث: ۲۴-۲۵)

عن معاذ رضی اللّٰہ عنہ: کنت ردف رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم علی حمار، لیس بینی و بینہ الا موخرۃ الرحل. فقال: یا معاذ، ھل تدری ما حق اللّٰہ علی عبادہ؟ وما حق العباد علی اللّٰہ؟ قلت: اللّٰہ ورسولہ اعلم. قال: فان حق اللّٰہ علی العباد ان یعبدوہ ولا یشرکوا بہ شیأ وحق العباد علی اللّٰہ ان لا یعذب من لا یشرك بہ شیأ. فقلت یا رسول اللّٰہ افلا ابشر بہ الناس؟ قال: لا تبشرھم فیتکلوا.

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

لغوی بحث

'ردف': سوار کے پیچھے بیٹھنے والا۔ اسی معنی میں 'ردیف' بھی آتا ہے۔

'مؤخرۃ': کجاوے کا ابھرا ہوا پچھلا حصہ۔

'تدری': 'دری' اہلِ لغت اس کے معنی 'کوشش' اور 'سعی سے جاننا' بیان کرتے ہیں۔ زمخشری کی رائے میں 'درایۃ' وہ معرفت ہے جو چالاکی یا فریب سے حاصل کی جائے۔ اردو میں اس کا صحیح مترادف ملنا محال ہے۔

'حق': یہاں حق کا لفظ 'واجب ولازم' کے معنی میں آیا ہے۔

'فیتکلوا': تکیہ کرنا۔ 'اتکال' یہاں اس سے مراد وہ بھروسا ہے، جس کے ساتھ سعی وجہد موجود نہ ہو۔

ترجمہ

''حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں گدھے پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے بیٹھا تھا۔ میرے اور آپ کے مابین صرف کجاوے کی ہتھی تھی۔ (اس طرح ہم جا رہے تھے) کہ آپ نے پوچھا: کیا تم جانتے ہو کہ اللہ کے بندوں پر اس کا کیا حق ہے؟ اور بندوں کا حق اللہ پر کیا ہے؟ میں نے عرض کی: اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپ نے بتایا: لاریب، اللہ کا حق بندوں پر یہ ہے کہ وہ اس کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرائیں اور بندوں کا حق اللہ پر یہ ہے کہ وہ اس کو عذاب نہ دے جو اس کے ساتھ شرک نہ کرے۔ اس پر میں نے عرض کی: تو کیا میں لوگوں کو اس کی بشارت نہ دوں؟ آپ نے کہا: بشارت نہ دو لوگ اسی پر تکیہ کر لیں گے۔''

متون

یہ روایت اور اس سے اگلی روایت ایک ہی روایت کے دو متن ہیں۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ اس روایت میں ادب و عقیدت کے وہ کلمات بیان نہیں ہوئے جو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پکارنے کے بعد ادا کیے تھے۔

بعض روایات میں 'ردف' اور 'مؤخرۃ' کی جگہ 'ردیف' اور 'اخرۃ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اسی طرح کچھ روایات میں گدھے کا نام 'عفیر' بتایا گیا ہے۔

بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں سوالات الگ الگ پوچھے تھے اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے دونوں بار 'اللّٰہ ورسولہ اعلم' کہہ کر اپنی سعادت مندی کا اظہار کیا تھا۔ ایک روایت میں یہ تصریح بھی ہے کہ حضرت معاذ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے روکنے کے باعث یہ بات ساری زندگی بیان نہیں کی۔ البتہ وفات کے موقع پر انھیں اس احساس نے بیان کرنے پر مجبور کر دیا کہ ان کے پاس دین کی ایک اہم حقیقت ہے اور انھیں اسے لوگوں تک پہنچا دینا چاہیے۔

بہر حال کوئی متن اس روایت میں کسی اہم معنوی پہلو کا اضافہ نہیں کرتا۔

معنی

اس روایت میں بنیادی طور پر شرک کی شناعت اور نجات کے لیے اس سے اجتناب کا مضمون بیان ہوا ہے۔

دین کی تعلیمات سے آگاہ ہر شخص یہ جانتا ہے کہ توحید کو اس میں اساس کی حیثیت حاصل ہے۔ انسان کی سنگین ترین غلطیوں میں سے سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ وہ خالق و مالک کائنات کے ساتھ کسی ہستی کو کسی بھی پہلو سے شریک مانے۔ چنانچہ تمام انبیا بنی نوع انسان کو اس غلطی سے بچاتے اور اس کے خوف ناک انجام سے باخبر کرتے رہے ہیں۔ قرآنِ مجید کے موضوعات میں بھی توحید کو اساسی حیثیت حاصل ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے ذریعے سے بھی اور اپنے الفاظ میں بھی اس حقیقت کو واضح کرتے رہے اس روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اللہ کا حق قرار دیا ہے۔ اس سے آپ کے پیشِ نظر یہ حقیقت واضح کرنا ہے کہ توحید کی حیثیت صرف ایک علمی مسئلے ہی کی نہیں ہے بلکہ اس کا خیال رکھنا تمھارے اخلاقی وجود کا تقاضا بھی ہے۔

اس روایت کا دوسرا اہم پہلو بشارت سے متعلق ہے۔ اس روایت میں یہ خبر دی گئی ہے کہ جو شخص شرک کے گناہ سے بچا رہے گا، اس کا اللہ تعالیٰ پر یہ حق قائم ہو جاتا ہے کہ وہ اسے بخش دے۔ لیکن یہاں یہ بات واضح رہے کہ اس بشارت کے مستحق وہ مسلمان ہیں جن سے روزمرہ کی زندگی میں چھوٹی موٹی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ اس کے مخاطب وہ مجرمین نہیں ہیں جو خون بہاتے، وارثت کا مال ہڑپ کر جاتے، ساری عمر برائی کو اوڑھنا بچھونا بنائے رکھتے اور موت کے آجانے پر بھی تائب نہیں ہوتے۔ اگلی روایت میں 'صدقاً من قلبه' کے الفاظ بھی اسی حقیقت کو واضح کرتے ہیں۔

اس روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کی بھی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اس سے آپ کے اپنے مخاطب کو اپنی طرف پوری طرح متوجہ کرنے کا طریقہ سامنے آتا ہے۔ آپ حضرت معاذ کو ایک اہم دینی نکتہ بتانا چاہتے تھے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ حضرت معاذ پوری طرح متوجہ ہوں اور بات کو اچھی طرح سمجھ کر ذہن میں محفوظ کر لیں۔ اسی طرح یہ روایت ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بات کو بیان کرتے ہوئے اپنے مخاطب کی شخصیت کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ آپ نے حضرت معاذ کو بات بتا دی لیکن اسے عام کرنے سے روک دیا۔ اس طرح آپ نے یہ واضح کر دیا کہ یہ نکتہ صرف ان کے لیے ہے جن کی سیرت دین کے سانچے میں ڈھل چکی ہے۔ آپ کے اس طریق کار سے دین کے داعیوں کے لیے یہ اصول واضح ہوتا ہے کہ ظرف قدح خوار کو ملحوظ رکھنا کس قدر ضروری ہے۔

اسی طرح ہمیں اس واقعے سے صحابہ کی سعادت مندی اور بالخصوص حضرت معاذ کے مقام و مرتبے کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

قرآن سے تعلق

قرآنِ مجید میں مختلف پیغمبروں کی دعوت بیان ہوئی ہے۔ ان میں اس بات کو بنیادی نکتے کی حیثیت حاصل ہے کہ اگر ان کی دعوت قبول کر لی گئی تو اس کا نتیجہ عذاب سے نجات ہے۔ مثلاً دیکھیے سورۂ نوح میں حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت میں یہی بات ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے:

قَالَ یٰقَوۡمِ اِنِّیۡ لَکُمۡ نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ. اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ وَاتَّقُوۡہُ وَاَطِیۡعُوۡنِ. یَغۡفِرۡ لَکُمۡ مِّنۡ ذُنُوۡبِکُمۡ وَیُؤَخِّرۡکُمۡ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی.(۷۱: ۲-۴)

”(حضرت نوح علیہ السلام) نے کہا: اے میری قوم کے لوگو، میں تمھارے لیے صاف صاف خبردار کر دینے والا ہوں۔ (میں تم کو دعوت دیتا ہوں) کہ اللہ کی عبادت کرو اور اس کی حدود کے پابند رہو اور میری بات مانو۔ (میں تمھیں بتاتا ہوں کہ اس کے نتیجے میں) اللہ تمھارے (وہ) گناہ معاف فرمائے گا (جو اس سے پہلے تم سے ہوئے) اور تمھیں ایک مقررہ مدت تک مہلت دے گا۔“

اگرچہ سیاق میں جس مہلت کا ذکر ہوا ہے اس کا تعلق اس دنیا سے ہے اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں دنیا کے عذاب سے بچنے کی خبر دی گئی ہے۔ لیکن گناہوں سے مغفرت کے الفاظ ہی سے واضح ہے کہ اس مغفرت میں، دنیا و آخرت دونوں شامل ہیں۔ اور یہ مغفرت اللہ تعالیٰ کے ایک وعدے کی حیثیت رکھتی ہے یہی بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی قوم سے کہی:

قُلۡ لِّلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اِنۡ یَّنۡتَہُوۡا یُغۡفَرۡ لَہُمۡ مَّا قَدۡ سَلَفَ.(۸: ۳۸)

”ان کفر کرنے والوں سے کہہ دو کہ اگر یہ باز آجائیں تو جو کچھ ہو چکا وہ معاف کر دیا جائے گا۔“

ان آیات سے یہ بات واضح ہے کہ پیغمبر کی دعوت قبول کر لینا، جس کا اہم ترین نکتہ توحید ہے، مغفرت کی ضمانت ہے۔ یہی ضمانت ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بندوں کے حق کی حیثیت سے بیان کر کے اللہ تعالیٰ کے وعدے پر یقین و اعتماد کو نئی جہت دی ہے۔

کتابیات

بخاری، کتاب الجہاد والسیر، باب ۳۶، کتاب اللباس، باب ۱۰۰، کتاب الاستئذان، باب ۳۰، کتاب الرقاق،

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

باب ۳۷، کتاب التوحید، باب ۱۔ مسلم، کتاب الایمان، باب ۱۰۔ ترمذی، کتاب الایمان، باب ۱۷۔ ابو داؤد، کتاب الجهاد، باب ۴۷۔ ابنِ ماجه، کتاب الزہد، باب ۳۵۔ اور مسندِ احمد عن انس بن مالک اور عن معاذ بن جبل۔

عن انس رضی اللّٰه عنه: ان النبی صلی اللّٰه علیه وسلم، و معاذ ردیفه علی الرحل، قال: یا معاذ. قال لبیك یا رسول اللّٰه و سعدیك. قال: یا معاذ. قال لبیك یا رسول و سعدیك. قال یا معاذ. قال: لبیك یا رسول اللّٰه و سعدیك ـــــ ثلاثا ـــــ قال: ما من احد یشهد ان لا الٰه الا اللّٰه و ان محمدا رسول اللّٰه، صدقا من قلبه الا حرمه اللّٰه علی النار. قال یا رسول اللّٰه، افلا اخبره الناس فیستبشروا. قال: اذا یتکلوا. فاخبربها معاذ عند مرته تاثما.

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

لغوی بحث

'لبیك': یہ 'لب' سے تثنیہ کا صیغہ ہے۔ اور اس سے تکرار کے معنی مراد ہیں۔ پوری بات اس طرح سے ہے: 'اجبت لك اجابة بعد اجابة'۔ اس ترکیب کا یہ مفہوم ادا کرنے کے لیے اردو میں ایک ہی لفظ کو دہرایا جاتا ہے۔ یہی حقیقت لفظ 'سعدیك' کی ہے۔

ترجمہ

''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم (سوار تھے) اور معاذ (رضی اللہ عنہ) کجاوے پر آپ کے پیچھے بیٹھے تھے۔ آپ نے فرمایا: اے معاذ۔ معاذ نے کہا: حاضر، اللہ کے رسول حاضر، میرے نصیب، میری خوش بختی۔ آپ نے پھر بلایا: اے معاذ۔ انھوں نے پھر جواب دیا: حاضر، اللہ کے رسول حاضر، میرے نصیب، میری خوش بختی۔ آپ نے پھر آواز دی: اے معاذ۔ انھوں نے پھر جواب دیا: حاضر، اللہ کے

رسول حاضر، میرے نصیب، میری خوش بختی ـــــ تین مرتبہ ـــــ حضرت انس کہتے ہیں کہ اس کے بعد آپ نے فرمایا: کوئی نہیں ہے جو یہ گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں، اپنے دل کی سچائی کے ساتھ، مگر یہ کہ اللہ اس پر آگ حرام کر دے۔ (آپ کی یہ بات سن کر معاذ نے) کہا: یا رسول اللہ کیا میں اس کی لوگوں کو خبر نہ دوں کہ وہ بھی یہ بشارت پائیں۔ آپ نے کہا: اس طرح تو وہ اسی پر تکیہ کرنے لگیں گے۔ چنانچہ معاذ نے یہ بات اپنی وفات کے وقت اس خوف سے بتا دی کہ کہیں انھیں گناہ نہ ہو۔''

دیگر مباحث

یہ حدیث اصل میں حدیث نمبر ۲۴ ہی ہے۔ ظاہر ہے ''متن''، ''معنی'' اور ''قرآن سے تعلق'' کے مباحث بھی وہی ہیں۔

کتابیات

بخاری، کتاب العلم باب ۴۹۔ مسلم، کتاب الایمان، باب ۱۰۔ مسند احمد عن انس بن مالک۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

میزان

جاوید احمد غامدی

اصول و مبادی

(۱۲)

مبادیِ تدبرِ قرآن

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

دین کی آخری کتاب

چھٹی چیز یہ ہے کہ قرآن جس دین کو پیش کرتا ہے، اُس کی وہ پہلی نہیں، بلکہ آخری کتاب ہے۔ اس دین کی تاریخ یہ ہے کہ انسان کو جب اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بھیجا تو اس کے بنیادی حقائق ابتدا ہی سے اس کی فطرت میں دویعت کر دیے۔ اُسے بتا دیا گیا کہ اولاً، اس کا ایک خالق ہے جس نے اُسے وجود بخشا ہے، وہی اُس کا مالک ہے اور اس کے لازمی نتیجے کے طور پر تنہا وہی ہے جسے اُس کا معبود ہونا چاہیے۔ ثانیاً، وہ اس دنیا میں امتحان کے لیے بھیجا گیا ہے اور اس کے لیے خیر و شر کے راستے نہایت واضح شعور کے ساتھ اسے سمجھا دیے گئے ہیں۔ پھر اسے ارادہ و اختیار ہی نہیں، زمین کا اقتدار بھی دیا گیا ہے۔ اس کا یہ امتحان دنیا میں اس کی زندگی کے آخری لمحے تک جاری رہے گا۔ وہ اگر اس میں کامیاب رہا تو اس کے صلے میں خدا کی ابدی بادشاہی اسے حاصل ہو جائے گی، جہاں نہ ماضی کا کوئی پچھتاوا ہو گا اور نہ مستقبل کا کوئی اندیشہ۔ ثالثاً، اس کی ضرورتوں کے پیشِ نظر اس کا خالق وقتاً فوقتاً اپنی ہدایت اسے بھیجتا رہے گا، پھر اس نے اگر اس ہدایت کی پیروی کی تو ہر قسم کی گمراہیوں سے محفوظ رہے گا اور اس سے گریز کا رویہ اختیار کیا تو قیامت میں ابدی شقاوت اس کا مقدر ٹھیرے گی۔

چنانچہ پروردگار نے اپنا یہ وعدہ پورا کیا اور انسانوں ہی میں سے کچھ ہستیوں کو منتخب کر کے اُن کے ذریعے سے اپنی یہ ہدایت بنی آدم کو پہنچائی۔ اس میں حکمت بھی تھی اور شریعت بھی۔ حکمت، ظاہر ہے کہ ہر طرح کے

تغیرات سے بالا تھی، لیکن شریعت کا معاملہ یہ نہ تھا۔ وہ ہر قوم کی ضرورتوں کے لحاظ سے اترتی رہی، یہاں تک کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی نبوت میں پوری انسانیت کے لیے اس کے احکام بہت حد تک ایک واضح سنت کی صورت اختیار کر گئے۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں جب بنی اسرائیل کی ایک باقاعدہ حکومت قائم ہو جانے کا مرحلہ آیا تو تورات نازل ہوئی اور اجتماعی زندگی سے متعلق شریعت کے احکام بھی اترے۔ اس عرصے میں حکمت کے بعض پہلو نگاہوں سے اوجھل ہوئے تو زبور اور انجیل کے ذریعے سے انھیں نمایاں کیا گیا۔ پھر ان کتابوں کے متن جب اپنی اصل زبان میں باقی نہیں رہے اور ان کی ہدایت بہت کچھ ضائع ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے آخری پیغمبر کی حیثیت سے مبعوث کیا اور انھیں یہ قرآن دیا۔ چنانچہ فرمایا ہے:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ؕ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ. (المائدہ ۵: ۴۸)

”اور (اے پیغمبر) ہم نے یہ کتاب تمھاری طرف حق کے ساتھ اتاری، اس شریعت کی تصدیق میں جو اس سے پہلے موجود ہے اور اس کے لیے محافظ بنا کر، اس لیے تم ان (اہل کتاب) کے درمیان اُس ہدایت کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے نازل کی ہے اور اس حق کو چھوڑ کر جو تمھارے پاس آ چکا ہے، ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو۔ ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک شریعت اور ایک راہِ عمل مقرر کی ہے۔ اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا، لیکن اُس نے چاہا کہ جو کچھ اُس نے تمھیں دیا ہے، اس میں تمھیں آزمائے۔ چنانچہ بھلائیوں کے لیے ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔ تم سب کو اللہ ہی کی طرف پلٹنا ہے، پھر وہ تمھیں بتا دے گا وہ سب چیزیں جن میں تم اختلاف کرتے رہے ہو۔“

یہ دین کی تاریخ ہے۔ چنانچہ قرآن کی دعوت اس کے پیشِ نظر جن مقدمات سے شروع ہوتی ہے، وہ یہ ہیں:

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

۱۔ دینِ فطرت کے حقائق،

۲۔ سنتِ ابراہیمی،

۳۔ نبیوں کے صحائف۔

پہلی چیز کو وہ اپنی اصطلاح میں معروف و منکر سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی وہ باتیں جو انسانی فطرت میں خیر کی حیثیت سے پہچانی جاتی ہیں اور وہ جن سے فطرت ابا کرتی اور انھیں برا سمجھتی ہے۔ قرآن ان کی کوئی جامع و مانع فہرست پیش نہیں کرتا، بلکہ اس حقیقت کو مان کر کہ انسان ابتدا ہی سے معروف و منکر، دونوں کو پورے شعور کے ساتھ بالکل الگ الگ پہنچانتا ہے، اُس سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ معروف کو اپنائے اور منکر کو چھوڑ دے:

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ. (التوبہ ۹:۷۱)

''اور مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ یہ باہم دگر معروف کی نصیحت کرتے ہیں اور منکر سے روکتے ہیں۔''

دوسری چیز کے لیے قرآن نے ملتِ ابراہیمی کی تعبیر اختیار کی ہے، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ یہ سب اسی ملت کے احکام ہیں جن سے قرآن کے مخاطب پوری طرح واقف، بلکہ بڑی حد تک ان پر عامل تھے۔ سیدنا ابوذر کے ایمان لانے کی جو روایت مسلم میں بیان ہوئی ہے، اس میں وہ صراحت کے ساتھ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے ہی وہ نماز کے پابند ہو چکے تھے۔[۲۹] جمعہ کی اقامت کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ قرآن کے مخاطبین کے لیے کوئی اجنبی چیز نہ تھی۔[۳۰] نمازِ جنازہ وہ پڑھتے تھے۔[۳۱] روزہ اسی طرح رکھتے تھے جس طرح اب ہم رکھتے ہیں۔[۳۲] زکوٰۃ ان کے ہاں بالکل اسی طرح ایک متعین شے تھی جس طرح اب متعین ہے۔[۳۳] حج و عمرہ سے متعلق ہر صاحبِ علم اس حقیقت کو جانتا ہے کہ قریش نے چند بدعتیں ان میں بے شک داخل کر دی تھیں، لیکن ان کے مناسک فی الجملہ وہی تھے جن کے مطابق یہ عبادات اس وقت ادا کی جاتی ہیں، بلکہ روایتوں سے

۲۹۔ مسلم، کتاب فضائل الصحابہ، باب ۱۳۲۔

۳۰۔ لسان العرب، ج ۲، ص ۳۵۹۔

۳۱۔ المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام، جواد علی، ج ۶، ص ۳۳۸۔

۳۲۔ المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام، جواد علی، ج ۶، ص ۳۴۲۔

۳۳۔ المعارج ۷۰: ۲۴۔

معلوم ہوتا ہے کہ لوگ ان بدعتوں پر متنبہ بھی تھے۔ چنانچہ بخاری میں بیان ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعثت سے پہلے جو حج کیا، وہ قریش کی ان بدعتوں سے الگ رہ کر بالکل اسی طریقے پر کیا، جس طریقے پر سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے حج ہمیشہ جاری رہا ہے۔[۳۴]

یہی معاملہ قربانی، اعتکاف، ختنہ اور بعض دوسرے آداب و شعائر کا ہے۔ یہ سب چیزیں پہلے سے رائج، معلوم و متعین اور نسلاً بعد نسلٍ جاری ایک روایت کی حیثیت سے پوری طرح متعارف تھیں۔ چنانچہ اس بات کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ قرآن ان کی تفصیل کرتا۔ لغتِ عرب میں جو الفاظ ان کے لیے مستعمل تھے، ان کا مصداق لوگوں کے سامنے موجود تھا۔ قرآن نے انھیں نماز قائم کرنے یا زکوٰۃ ادا کرنے یا روزہ رکھنے یا حج و عمرہ کے لیے آنے کا حکم دیا تو وہ جانتے تھے کہ نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج و عمرہ کن چیزوں کے نام ہیں۔ قرآن نے ان میں سے کسی چیز کی ابتدا نہیں کی، ان کی تجدید و اصلاح کی ہے۔ اور وہ ان سے متعلق کسی بات کی وضاحت بھی اسی حد تک کرتا ہے، جس حد تک تجدید و اصلاح کی اس ضرورت کے پیشِ نظر اس کے لیے ناگزیر ہوتی ہے۔ دینِ ابراہیمی کی یہ ساری روایت اس کے نزدیک خدا کا دین ہے اور اپنے اوپر ایمان لانے والوں کو وہ اسے پورا کا پورا اپنانے کی تلقین کرتا ہے:

ثُمَّ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ اَنِ اتَّبِعۡ مِلَّۃَ اِبۡرٰہِیۡمَ حَنِیۡفًا ؕ وَمَا کَانَ مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ. (النحل ۱۶: ۱۲۳)

”پھر ہم نے تمھیں وحی کی کہ ملتِ ابراہیم کی پیروی کرو جو بالکل یک سو تھا اور مشرکوں میں سے نہیں تھا۔“

تیسری چیز وہ صحیفے ہیں جو اس وقت تورات، زبور اور انجیل کی صورت میں بائبل کے مجموعۂ صحائف میں موجود ہیں۔ ان کے بدقسمت حاملین نے ان کا ایک حصہ اگرچہ ضائع کر دیا اور ان میں بہت کچھ تحریفات بھی کر دی ہیں، لیکن اس کے باوجود خدا کی نازل کردہ حکمت اور شریعت کا ایک بڑا خزانہ اب بھی ان میں دیکھ لیا جا سکتا ہے۔ قرآن کے طالب علم جانتے ہیں کہ اس نے جگہ جگہ ان کے حوالے دیے ہیں، نبیوں کی جو سرگزشتیں ان میں بیان ہوئی ہیں، ان کی طرف بالاجمال اشارے کیے ہیں اور ان میں یہود و نصاریٰ کی تحریفات کی تردید اور ان کی پیش کردہ تاریخ پر تنقید کی ہے۔ اہلِ کتاب پر قرآن کا سارا اتمامِ حجت انھی صحائف پر مبنی ہے اور وہ صاف اعلان کرتا ہے کہ اس کا سرچشمہ وہی ہے جو ان صحیفوں کا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

۳۴۔ بخاری، کتاب الحج، باب ۱۹۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ. مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ط اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ط وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ.

(آلِ عمران ۳: ۳-۴)

''اس نے تم پر کتاب اتاری ہے، (اے پیغمبر)، حق کے ساتھ، اُس کی مصداق بنا کر جو اِس سے پہلے موجود ہے، اور اس نے تورات اور انجیل اتاری، اس سے پہلے لوگوں کے لیے ہدایت بنا کر اور (اس کے بعد) یہ فرقان اتارا ہے۔ بے شک، وہ لوگ جو اللہ کی آیتوں کے منکر ہوئے، اُن کے لیے بڑا سخت عذاب ہے، اور اللہ زبردست ہے، وہ انتقام لینے والا ہے۔''

اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ج وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ ج وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا.

(النساء ۴: ۱۶۳)

''ہم نے تمھاری طرف وحی کی، (اے پیغمبر)، اسی طرح جس طرح نوح کی طرف وحی کی اور اُس کے بعد آنے والے پیغمبروں کی طرف اور ابراہیم کی طرف وحی کی اور اسمٰعیل، اسحٰق، یعقوب، اس کی اولاد اور عیسیٰ، ایوب، یونس، ہارون اور سلیمان کی طرف اور ہم نے داؤد کو زبور عطا فرمائی۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

قرآن کا یہی پس منظر ہے جس کی رعایت سے یہ چند باتیں اس کی شرح و تفسیر میں بطورِ اصول ماننی چاہییں:

اول یہ کہ پورا دین خوب و ناخوب کے شعور پر مبنی ان حقائق سے مل کر مکمل ہوتا ہے جو انسانی فطرت میں روزِ اول سے ودیعت ہیں اور جنھیں قرآن معروف اور منکر سے تعبیر کرتا ہے۔ شریعت کے جو اوامر و نواہی تعین کے ساتھ قرآن میں بیان ہوئے ہیں، وہ ان معروفات و منکرات کے بعد اور ان کی اساس پر قائم ہیں۔ انھیں چھوڑ کر شریعت کا کوئی تصور اگر قائم کیا جائے گا تو وہ ہر لحاظ سے ناقص اور قرآن کے منشا کے بالکل خلاف ہو گا۔

دوم یہ کہ سنت قرآن کے بعد نہیں، بلکہ قرآن سے مقدم ہے، اس لیے وہ لازماً اس کے حاملین کے اجماع و تواتر ہی سے اخذ کی جائے گی۔ قرآن میں اس کے جن احکام کا ذکر ہوا ہے، ان کی تفصیلات بھی اسی اجماع و تواتر پر مبنی روایت سے متعین ہوں گی۔ انھیں قرآن سے براہِ راست اخذ کرنے کی کوشش نہیں کی جائے گی، جس طرح کہ قرآن کے بزعم خود بعض مفکرین نے اس زمانے میں کی ہے اور اس طرح قرآن کا مدعا بالکل الٹ کر رکھ

دیا ہے۔

سوم یہ کہ یہود و نصاریٰ کی تاریخ انبیاے بنی اسرائیل کی سر گزشتوں اور اس طرح کے دوسرے موضوعات سے متعلق قرآن کے اشارات کو سمجھنے اور اس کے اجمال کی تفصیل کے لیے قدیم صحیفے ہی اصل ماخذ ہوں گے۔ بحث و تنقید کی ساری بنیاد انھی پر رکھی جائے گی۔ اس باب میں جو روایتیں تفسیر کی کتابوں میں نقل ہوئی ہیں اور زیادہ تر سنی سنائی باتوں پر مبنی ہیں، انھیں ہر گز قابل التفات نہ سمجھا جائے گا۔ ان موضوعات پر جو روشنی قدیم صحیفوں سے حاصل ہوتی ہے اور قرآن کے الفاظ جس طرح ان کی تفصیلات کو قبول کرتے یا ان کی تردید کر کے اصل حقائق کو واضح کرتے ہیں، اس کا بدل یہ روایتیں ہرگز نہیں ہو سکتیں جن سے نہ قرآن کے کسی طالب علم کے دل میں کوئی اطمینان پیدا ہوتا ہے اور نہ اہلِ کتاب ہی پر وہ کسی پہلو سے حجت قرار پا سکتی ہیں۔

[باقی]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

میزان

جاوید احمد غامدی

قانونِ دعوت

(نئی اشاعت کے لیے مصنف کی طرف
سے نظر ثانی اور ترمیم و اضافہ کے بعد)

(۳)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۴۔ پیغمبر کا انذار

یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاھِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا. وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.(الاحزاب۳۳: ۴۵-۴۶)

''اے پیغمبر، ہم نے تمھیں گواہی دینے والا اور خوش خبری پہنچانے والا اور انذار کرنے والا اور اللہ کی طرف، اس کے اذن سے، دعوت دینے والا اور (انسانوں کی ہدایت کے لیے) ایک روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔''

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب دعوت ہے جس کی وضاحت اللہ تعالیٰ نے اِن آیات میں پوری تفصیل کے ساتھ کر دی ہے۔ اللہ کے جو پیغمبر بھی اِس دنیا میں آئے، قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اِسی دعوت الی اللہ اور انذار و بشارت کے لیے آئے۔ سورۂ بقرہ کی آیت 'کان الناس امة واحدة فبعث اللّٰه النبيين مبشرين و منذرين'[۳] میں یہی بات بیان ہوئی ہے۔ اِن نبیوں میں سے اللہ تعالیٰ نے جنھیں رسالت کے منصب پر فائز کیا،

۳۔ ۲: ۲۱۳۔ ''لوگ ایک ہی جماعت تھے، (اُنھوں نے اختلاف کیا) تو اللہ نے نبی بھیجے، بشارت دیتے اور انذار کرتے

اُن کے بارے میں البتہ، قرآن بتاتا ہے کہ وہ اِس انذار کو اپنی قوموں پر شہادت کے مقام تک پہنچا دینے کے لیے بھی مامور تھے۔ قرآن کی اصطلاح میں اِس کے معنی یہ ہیں کہ حق لوگوں پر اِس طرح واضح کر دیا جائے کہ اِس کے بعد کسی شخص کے لیے اُس سے انحراف کی گنجایش نہ ہو: 'لئلا یکون للناس علی اللّٰه حجة بعد الرسل'[۴] (تاکہ رسولوں کے بعد لوگوں کے لیے اللہ کے سامنے کوئی عذر پیش کرنے کے لیے باقی نہ رہے)۔ سورۂ احزاب کی اِن آیات میں 'شاھدًا' کا لفظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اِسی منصب کو بیان کرنے کے لیے آیا ہے۔ نبیوں کا انذار و بشارت تو کسی وضاحت کا تقاضا نہیں کرتا، لیکن رسولوں کا معاملہ اِس سے مختلف ہے۔ انذار و بشارت کے ساتھ وہ شہادت کی جس ذمہ داری کے لیے مامور ہوتے ہیں، اُس کے تقاضے سے اُن کی دعوت کے چند مراحل اور اُن مراحل کے چند لازمی نتائج ہیں جو اُنھی کے ساتھ خاص ہیں۔ یہ دعوت کی کسی دوسری صورت سے متعلق نہیں ہیں۔ رسولوں کی دعوت کے یہی مراحل ہم تفصیل کے ساتھ یہاں بیان کریں گے۔

انذار

یہ اِس دعوت کا پہلا مرحلہ ہے۔ ''انذار'' کے معنی کسی برے نتیجے سے لوگوں کو خبردار کرنے کے ہیں۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول اپنی قوم کو ہمیشہ دو عذابوں سے خبردار کرتے رہے ہیں: ایک وہ جس سے اُن کے منکرین قیامت میں دوچار ہوں گے اور دوسرا وہ جو اُن کی دعوت کے مقابلے میں سرکشی اختیار کرنے والوں پر اِسی دنیا میں نازل ہو گا۔ وہ اپنی قوم کو بتاتے ہیں کہ وہ زمین پر ایک قیامت صغریٰ برپا کر دینے کے لیے مبعوث ہوئے ہیں۔ خدا کی حجت جب اُن کی دعوت سے پوری ہو جائے گی تو اُن کی قوم کو اپنی سرکشی کا نتیجہ لازماً اِسی دنیا میں دیکھنا ہو گا۔ قرآن کے چھٹے باب میں سورۂ قمر اِس انذار کی بہترین مثال ہے۔ اُس میں رسولوں سے متعلق اپنی سنت کا حوالہ دے کر اللہ تعالیٰ نے بڑی تہدید کے اسلوب میں فرمایا ہے: 'اکفارکم خیر من اولئکم ام لکم براۃ فی الذبر'[۵] (کیا تمھارے یہ منکر اُن سے کچھ بہتر ہیں یا اِن کے لیے صحیفوں میں

ہوئے۔''

۴۔ النساء ۴: ۱۶۵۔

۵۔ ۵۴: ۴۳۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

کوئی معافی لکھی ہوئی ہے)؟قرآن کے آخری باب میں الملک (۶۷) سے الجن (۷۲) تک چھ سورتیں، خود قرآن کے نظم ہی سے پوری قطعیت کے ساتھ واضح ہو جاتا ہے کہ اِسی مرحلے کی سورتیں ہیں۔ اِن سورتوں کے مطالعے سے قرآن کا ہر طالب علم اُس لب و لہجے، اسلوب اور طرز استدلال کا اندازہ کر سکتا ہے جو اللہ کے رسول اِس مرحلے میں اختیار کرتے ہیں۔ سورۂ قلم میں باغ والوں کی تمثیل بیان کر کے قرآن نے اِس انذار کا خلاصہ اِس طرح بیان فرمایا ہے:

كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ۭ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ.(۶۸:۳۳)

”(ام القریٰ کے لوگو، تم اِس پیغمبر کو جھٹلا رہے ہو تو دیکھ لو) اِس طرح آئے گا عذاب اور آخرت کا عذاب تو اِس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اے کاش، یہ لوگ اُس کو جانتے۔“

اِس انذار کو چونکہ اِس دنیا میں لازماً ایک حتمی نتیجے تک پہنچنا ہوتا ہے، اِس لیے اِس میں اصلاً اُنھی لوگوں کو مخاطب کیا جاتا ہے جو کسی نہ کسی پہلو سے اپنی قوم میں اثر و رسوخ رکھتے ہوں؛ عوام اپنے علم و عمل اور سیرت و اخلاق میں جن کے تابع ہوں؛ جن کی بیماری دوسروں کے لیے بیماری اور تندرستی تندرستی کا باعث بنتی ہو؛ جن کے دل و دماغ کا مفتوح ہو جانا سب کے مفتوح ہو جانے کا ذریعہ ہو؛ جن کے پاس مادی ذرائع و وسائل کی افراط حق کی قوت میں اضافہ کر سکے؛ جو اپنی ذہنی رفعت سے دعوت کو علم و عمل کی بے پناہ قوتوں کا سیلاب بنا دینے کی صلاحیت رکھتے ہوں اور عوام جن کی دلیلوں کے تار و پود بکھرتے، جن کے فکر و فلسفہ کی جڑیں اکھڑتے اور جن کے نظام اخلاق و سیاست کے فلک بوس محلوں کی بنیادیں جب تک اپنی آنکھوں سے متزلزل ہوتے نہ دیکھ لیں، اُس وقت تک نہ دعوت حق کے لیے پوری طرح یک سو ہو سکتے ہوں، نہ پرانے معتقدات کے گرداب سے نکل سکتے ہوں، نہ اُن کے بارے میں تذبذب سے نجات پا سکتے ہوں اور نہ کسی دعوت کی حمایت میں وہ ذہنی رفعت محسوس کر سکتے ہوں جس سے حوصلہ پا کر بدر و حنین کے مجاہدوں کی طرح وہ اِن صنادید کی قوت و عظمت کا طلسم توڑ دیں۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

قرآن مجید سے پیغمبروں کے انذار کی یہ خصوصیت جس طرح سامنے آتی ہے، اِس کی وضاحت میں استاذ امام امین احسن اصلاحی اپنی کتاب ”دعوت دین اور اُس کا طریق کار“ میں لکھتے ہیں:

”... حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے خود اپنے اُس خاندان کو دعوت دی جو قوم کی مذہبی

پیشوائی کی مسند پر متمکن تھا۔ پھر اُس بادشاہ کو دعوت دی جس کے ہاتھوں میں سیاسی اقتدار کی باگ تھی اور جو اپنے آپ کو لوگوں کی زندگی اور موت کا مالک سمجھے ہوئے بیٹھا تھا... حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ سب سے پہلے فرعون کو مخاطب کریں... حضرت مسیح علیہ السلام نے سب سے پہلے علمائے یہود کو دعوت دی۔ اِسی طرح حضرات نوح علیہ السلام، ہود علیہ السلام، شعیب علیہ السلام، سب کی دعوتیں قرآن مجید میں مذکور ہیں۔ اِن میں سے ہر نبی نے سب سے پہلے اپنے وقت کے ارباب اقتدار اور متکبرین کو جھنجھوڑا اور اُن کے افکار و نظریات پر ضرب لگائی۔ سب سے آخر میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اور آپ کو حکم ہوا کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈراؤ۔ یہ لوگ عرب کی مذہبی اور پدرسرانہ (patriarchical) حکومت کے ارباب حل و عقد تھے اور اِس کے واسطے سے سارے عرب کی اخلاقی اور سیاسی رہنمائی کر رہے تھے۔" (۴۹)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَكَذٰلِكَ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ قُرۡاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنۡذِرَ اُمَّ الۡقُرٰى وَمَنۡ حَوۡلَهَا وَتُنۡذِرَ يَوۡمَ الۡجَمۡعِ لَا رَيۡبَ فِيۡهِ ؕ فَرِيۡقٌ فِى الۡجَنَّةِ وَفَرِيۡقٌ فِى السَّعِيۡرِ. (الشوریٰ ۴۲:۷)

"اور اِسی طرح ہم نے تم پر یہ قرآنِ عربی وحی کیا ہے کہ تم ام القریٰ اور اُس کے گرد و پیش میں بسنے والوں کو خبردار کر دو اور اُس روز محشر سے خبردار کر دو جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں، جہاں ایک جماعت کو جنت میں جانا ہے اور ایک کو جہنم میں۔"

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

انذار عام

یہ دوسرا مرحلہ ہے۔ اِس میں اور مرحلۂ انذار میں اِس کے سوا کوئی فرق نہیں ہے کہ اُس میں دعوت فرداً فرداً یا نجی کی بعض مجالس ہی میں پیش کی جاتی ہے، لیکن اِس مرحلے میں پیغمبر کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ کھلم کھلا اپنی قوم کو پکارنے کے لیے اٹھے اور جس حد تک اور جن ذرائع سے بھی ممکن ہو، اپنی دعوت ہانکے پکارے اُن کے سامنے رکھ دے۔ پیغمبروں کی دعوت میں یہ مرحلہ بڑا ہی سخت ہوتا ہے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت میں جب یہ مرحلہ آیا تو اِس کی تیاریوں کے لیے آپ کو قیام اللیل کا حکم دیا گیا۔ قرآن کی سورۂ مزمل اِسی موقع پر نازل ہوئی ہے۔ اِس میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو رات کی نماز کے لیے اٹھنے، اُس میں

ٹھیر ٹھیر کر قرآن پڑھنے، اپنے پروردگار کی صفات پر متنبہ ہو کر اپنے دل کو اُس کی یاد سے معمور اور زبان کو اُس کی تسبیح و تحمید سے تر رکھنے اور رات کی تنہائی میں سب سے ٹوٹ کر اُسی کے ساتھ لو لگانے کی ہدایت کی اور فرمایا کہ یہ ہدایت ہم اِس لیے کر رہے ہیں کہ 'انا سنلقی علیک قولًا ثقیلًا'[۶] (عنقریب ایک بھاری بات کا بوجھ ہم تم پر ڈال دیں گے)۔ چنانچہ اِس کے بعد کی سورہ میں یہ بوجھ آپ پر ڈال دیا گیا اور ارشاد ہوا:

يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ. قُمْ فَاَنْذِرْ. وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ. وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ. وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ. وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ. وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ. (المدثر ۷۴: ۱-۷)

''اے اوڑھ لپیٹ کر بیٹھنے والے، اٹھو اور انذار عام کے لیے کھڑے ہو جاؤ اور اپنے پروردگار ہی کی بڑائی بیان کرو اور اپنے دامن دل کو پاک رکھو اور شرک کی اِس غلاظت سے دور رہو اور دیکھو اپنی سعی کو زیادہ خیال کر کے منقطع نہ کر بیٹھو اور اپنے پروردگار کے فیصلے کے انتظار میں ثابت قدم رہو۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

دعوت کی ترتیب اِس مرحلے میں بھی وہی رہتی ہے اور اصلاً قوم کے پیشوا اور ارباب حل و عقد ہی پیغمبر کے مخاطب ہوتے ہیں، لیکن انذار عام کی شدت اُس رد عمل کو بھی پوری قوت سے سامنے لے آتی ہے جو مرحلۂ انذار میں اِس طرح نمایاں نہیں ہوتا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جو لوگ سب سے پہلے ایمان لائے، وہ چونکہ زیادہ تر نوجوان تھے، اِس لیے یہ رد عمل بھی اولاً اُن کے اعزہ و احباب اور متعلقین کی طرف سے ظاہر ہوا۔ قوم کے زعما اُس وقت میدان میں آئے، جب اُنھوں نے دیکھا کہ پیغمبر کی دعوت اب معاشرے میں موثر ہو رہی ہے۔ پھر اُنھوں نے جو کچھ کیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اِس موقع پر جو رویہ اختیار کرنے کی ہدایت ہوئی، وہ اِس مرحلے کی سورتوں میں جگہ جگہ بیان ہوا ہے۔ سورۂ یونس کے اِن دو مقامات سے اِس کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ فرمایا ہے:

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا

''اور جب ہماری آیتیں اُن کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں، نہایت صاف تو وہ لوگ جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے، کہتے ہیں کہ اِس کے بجاے کوئی اور قرآن لاؤ یا اِس میں کچھ ترمیم کرو۔ اِن سے کہہ

۶۔ دعوتِ دین اور اس کا طریقِ کار، باب ۳، ص ۴۹-۵۰۔

مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ.(۱۰:۱۵)

دو: یہ میرا کام نہیں ہے کہ میں اپنی طرف سے اِس میں ترمیم کر دوں۔ میں تو بس اُس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس آتی ہے۔ میں نے اگر اپنے پروردگار کی نافرمانی کی تو میں ایک بڑے ہول ناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔''

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ ۚۖ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ. وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ. (۱۰:۱۰۵-۱۰۴)

''اِن سے کہہ دو: لوگو، اگر تم میرے دین کے بارے میں کسی تردد میں مبتلا ہو تو سن لو کہ تم اللہ کے سوا جن کی عبادت کرتے ہو، میں اُن کی عبادت نہیں کرتا، بلکہ اُس اللہ کی عبادت کرتا ہوں جو تمھیں وفات دیتا ہے اور مجھے حکم ہوا ہے کہ میں اہل ایمان میں سے ہوں اور حکم ہوا ہے کہ پوری یک سوئی کے ساتھ اپنا رخ سیدھا دین حق کی طرف کر لوں اور ہرگز اِن مشرکوں میں سے نہ ہوں۔''

یہی مقام ہے جس تک پہنچنے کے بعد پھر اِس مرحلے میں وہ وقت بھی آجاتا ہے جب پیغمبر کو اِن متکبرین کے بہت زیادہ درپے ہونے سے روک دیا جاتا ہے اور ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ اب اپنے ساتھیوں کی تربیت ہی کو اصلاً اپنی توجہات کا مرکز بنائے۔ قرآن میں یہ ہدایت اِس طرح بیان ہوئی ہے:

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَآ اَنْتَ بِمَلُوْمٍ. وَّذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ. (الذاریات ۵۱:۵۴-۵۵)

''اِس لیے اب تم اِن سے اعراض کرو۔ اب تم پر کوئی الزام نہیں اور یاددہانی کرتے رہو، کیونکہ یاددہانی اہل ایمان کو نفع دیتی ہے۔''

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى. اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى. وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى. اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى. اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى. فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى. وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى. وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى. وَهُوَ يَخْشٰى. فَاَنْتَ عَنْهُ

''اُس نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیر لیا ـــــ، اِس پر کہ (قریش کے سرداروں کے ساتھ اُس کی مجلس میں) وہ نابینا آگیا اور تمھیں کیا معلوم، (اے پیغمبر) کہ شاید وہ (پوچھتا اور) سدھرتا یا (تم سناتے)، وہ نصیحت سنتا اور یہ نصیحت اُس کے کام

تَلَهّٰی. كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ. فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ. فِیْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ. مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ. بِاَیْدِیْ سَفَرَةٍ. كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ.

(عبس ۸۰: ۱-۱۶)

آتی۔ یہ جو بے پروائی برتتے ہیں، اُن کے تو تم پیچھے پڑتے ہو، دراں حالیکہ یہ اگر نہ سدھریں تو تم پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ اور وہ جو شوق سے تمھارے پاس آتا ہے اور (خدا سے) ڈرتا بھی ہے تو اُس سے تم بے پروائی برتتے ہو۔ ہر گز نہیں، (اِن کے پیچھے پڑنے کی ہر گز ضرورت نہیں ہے)۔ یہ تو ایک یاددہانی ہے۔ سو جس کا جی چاہے، اِس سے یاددہانی حاصل کرے (اور جس کا جی چاہے، کانوں میں انگلیاں ٹھونس لے)۔ ادب کے لائق، بلند اور اچھوتے صحیفوں میں، بہت صاحب عزت، بہت وفادار لکھنے والوں کے ہاتھوں میں۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اتمام حجت

یہ تیسرا مرحلہ ہے۔ اِس تک پہنچنے میں حقائق اِس قدر واضح ہو جاتے ہیں کہ مخاطبین کے پاس کوئی عذر پیش کرنے کے لیے باقی نہیں رہ جاتا۔ یہی چیز ہے جسے اصطلاح میں اتمام حجت سے تعبیر کیا جاتا ہے، یعنی جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے، وہ اِس طرح مبرہن ہو جائے کہ ضد، ہٹ دھرمی اور عناد کے سوا کوئی چیز بھی آدمی کو اُس کے انکار پر آمادہ نہ کر سکے۔ اِس میں ظاہر ہے کہ خدا کی دینونت کے ساتھ اسلوب، استدلال، کلام اور پیغمبر کی ذات و صفات اور علم و عمل، ہر چیز موثر ہوتی ہے، یہاں تک کہ معاملہ کھلے آسمان پر چمکتے ہوئے سورج کی طرح روشن ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اِس موقع پر پیغمبر اپنے مخاطبین کا انجام بھی بڑی حد تک واضح کر دیتا ہے اور دعوت میں بھی بالکل آخری تنبیہ کا لب و لہجہ اختیار کر لیتا ہے۔ قرآن مجید کی سورۂ فیل اور سورۂ قریش میں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے اِسی مرحلۂ اتمام حجت کے اختتام پر نازل ہوئی ہیں، یہ دونوں چیزیں بہت نمایاں ہیں۔ ارشاد فرمایا ہے:

اَلَمْ تَرَ كَیْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِیْلِ. اَلَمْ یَجْعَلْ كَیْدَهُمْ فِیْ تَضْلِیْلٍ. وَّاَرْسَلَ عَلَیْهِمْ طَیْرًا اَبَابِیْلَ. تَرْمِیْهِمْ

''تو نے دیکھا نہیں کہ تیرے پروردگار نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟ اُن کی چال کیا اُس نے اکارت نہیں کر دی؟ اور اُن پر جھنڈ کے

بِحِجَارَةٍ مِّنۡ سِجِّيۡلٍ. فَجَعَلَهُمۡ كَعَصۡفٍ مَّاۡكُوۡلٍ.(۱۰۵:۵-۱)

جھنڈ پرندے مسلط نہیں کر دیے ؟(اِس طرح کہ) تو پکی ہوئی مٹی کے پتھر اُنھیں مار رہا تھا اور اُس نے اُنھیں کھایا ہوا بھوسا بنا دیا۔"

لِاِيۡلٰفِ قُرَيۡشٍ. اٖلٰفِهِمۡ رِحۡلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيۡفِ. فَلۡيَعۡبُدُوۡا رَبَّ هٰذَا الۡبَيۡتِ. الَّذِيۡۤ اَطۡعَمَهُمۡ مِّنۡ جُوۡعٍ ڏ وَّاٰمَنَهُمۡ مِّنۡ خَوۡفٍ.(۱۰۶:۱-۴)

"قریش کو مانوس کر دینے کے باعث ، (اور کچھ نہیں تو حرم کے سایۂ امن میں) سردی اور گرمی کے سفروں سے اُن کو مانوس کر دینے ہی کے باعث ، اُنھیں چاہیے کہ وہ اِس گھر کے مالک کی عبادت کریں جس نے (اِن بنجر پہاڑوں کی) بھوک میں اُنھیں کھلایا اور (اِن کے) خوف میں اُنھیں امن عطا فرمایا۔"

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

پہلی سورہ ، اگر غور کیجیے تو قریش کو اِس حقیقت پر متنبہ کرتی ہے کہ جس پروردگار نے تمھارے سامنے اپنے دشمنوں کو اِس طرح پامال کیا ہے ، تم اُس کی دشمنی کے لیے اٹھے ہو تو تمھارا انجام بھی اُن سے مختلف نہ ہو گا ، اور دوسری سورہ اُنھیں اِس بات کی تلقین کرتی ہے کہ جس گھر کی تولیت اُنھیں حاصل ہے ، یہ اُسی کا مالک ہے جس نے اُنھیں رزق اور امن سے نوازا ہے ، لٰہذا اُس کا یہ حق تو کم سے کم اُنھیں پہچاننا چاہیے کہ اِس دنیا میں وہ اُسی کے بندے بن کر رہیں۔

دعوت کے اِس مرحلے میں پیغمبر کا اسلوب یہی ہوتا ہے۔

ہجرت و براءت

یہ چوتھا مرحلہ ہے۔ اللہ کے پیغمبر جب تبلیغ کا حق بالکل آخری درجے میں ادا کر دیتے ہیں اور حجت تمام ہو جاتی ہے تو یہ مرحلہ آ جاتا ہے۔ اِس میں قوم کے سرداروں کی فرد قرارداد جرم بھی پوری وضاحت کے ساتھ اُنھیں سنا دی جاتی ہے اور یہ بات بھی بتا دی جاتی ہے کہ اُن کا پیمانۂ عمر لبریز ہو چکا۔ لٰہذا اب اُن کی جڑیں اِس زمین سے لازماً کٹ جائیں گی۔ اِس کے ساتھ پیغمبر کو بھی بشارت دی جاتی ہے کہ نصرت خداوندی کے ظہور کا وقت آ پہنچا۔ وہ اور اُس کے ساتھی اب نجات پائیں گے اور جس سرزمین میں وہ کمزور اور بے بس تھے ، وہاں اُنھیں سرفرازی حاصل ہو جائے گی۔ اِس لیے اپنی قوم کی تکفیر اور اُس کے عقیدہ و مذہب سے بے زاری کا اعلان کر کے

وہ اب اُسے چھوڑنے کے لیے تیار ہو جائیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت میں یہ سب جس طرح ہوا، وہ قرآن کی اِن سورتوں سے واضح ہے:

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ. فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ. وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ. فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ. الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ. الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ. وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ.(الماعون۱۰۷:۱-۷)

”تم نے دیکھا اُسے جو روز جزا کو جھٹلاتا ہے، (اے پیغمبر)؟ یہ وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا اور مسکین کو کھلانے کے لیے نہیں ابھارتا۔ اِس لیے بربادی ہے (حرم کے پروہت) اِن نمازیوں کے لیے جو اپنی نمازوں (کی حقیقت) سے غافل ہیں۔ یہ جو (عبادت کی) نمایش کرتے اور برتنے کی کوئی ادنیٰ چیز بھی کسی کو دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔“

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ. فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ. اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ. (الکوثر۱۰۸:۱-۳)

”ہم نے یہ خیر کثیر (اپنا یہ گھر) تمھیں عطا کر دیا ہے، (اے پیغمبر)۔ اِس لیے تم (اِس میں اب) اپنے پروردگار ہی کی نماز پڑھنا اور اُسی کے لیے قربانی کرنا۔ اِس میں شبہ نہیں کہ تمھارا یہ دشمن ہی جڑ کٹا ہے، اِس کا کوئی نام لیوا نہ رہے گا۔“

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ. لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ. وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ. وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ. وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ. لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ.(الکافرون۱۰۹:۱-۶)

”تم اعلان کرو، (اے پیغمبر) کہ اے کافرو، میں اُن چیزوں کی عبادت نہ کروں گا جن کی تم عبادت کرتے ہو اور نہ تم کبھی (تنہا) اُس کی عبادت کرو گے جس کی عبادت میں کرتا ہوں اور نہ اِس سے پہلے کبھی میں اُن چیزوں کی عبادت کے لیے تیار ہوا جن کی عبادت تم نے کی اور نہ تم (تنہا) اُس کی عبادت کے لیے کبھی تیار ہوئے جس کی عبادت میں کرتا رہا ہوں۔ (اِس لیے اب) تمھارے لیے تمھارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین۔“

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ وَالۡفَتۡحُ. وَرَاَيۡتَ النَّاسَ يَدۡخُلُوۡنَ فِيۡ دِيۡنِ اللّٰهِ اَفۡوَاجًا. فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ وَاسۡتَغۡفِرۡهُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا.(النصر ۱۱۰: ۱-۳)

''اللہ کی مدد اور وہ فتح جب آ جائے (جس کا وعدہ ہم نے تم سے کیا ہے)، اور تم لوگوں کو جوق در جوق اللہ کے دین میں داخل ہوتے دیکھ لو تو اپنے پروردگار کی تسبیح کرو اُس کی حمد کے ساتھ اور اُس سے معافی چاہو۔ (اِس لیے کہ) وہ بڑا ہی معاف کرنے والا ہے۔''

اِس کے بعد پیغمبر کو ہجرت کا حکم دے دیا جاتا ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس ہجرت کا حکم اللہ تعالیٰ ہی دیتے ہیں، اِس کا فیصلہ کوئی پیغمبر اپنے اجتہاد سے نہیں کر سکتا۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ کسی انسان کے لیے اپنی عقل و رائے سے یہ فیصلہ کر لینا کہ اُس کی طرف سے حجت پوری ہو گئی ہے اور قوم کی طرف سے دعوت حق کے لیے اب کسی مثبت رد عمل کی توقع نہیں کی جا سکتی، کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ قوم لوط کے متعلق یہ فیصلہ لے کر جب خدا کے فرشتے ابراہیم جیسے جلیل القدر پیغمبر کے پاس آئے تو اُنھوں نے اِسے قبل از وقت سمجھا اور اِس کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے مجادلہ کیا۔[۷] اور یونس علیہ السلام نے اپنی راے سے یہ فیصلہ کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے اُس پر سخت مواخذہ کیا[۸] اور اُن کے رجوع کے بعد اُن کی قوم کے ایمان سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ توفیق ہدایت کا وقت صرف اللہ کے علم میں ہے۔ قرآن مجید اِنھی کی مثال پیش کر کے واضح کرتا ہے کہ اللہ کے پیغمبر کو اِس معاملے میں پوری استقامت کے ساتھ اللہ کے فیصلے کا منتظر رہنا چاہیے۔ وہ اپنی راے سے یہ خیال کر کے کہ اُس کی طرف سے فرض دعوت کافی حد تک ادا ہو چکا، اپنی قوم کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ اُس پر لازم ہے کہ وہ جس ذمہ داری پر مامور ہوا ہے، اُس میں برابر لگا رہے، یہاں تک کہ اُس کا پروردگار ہی یہ فیصلہ کر دے کہ حجت پوری ہو گئی، قوم کی مہلت ختم ہوئی اور اب پیغمبر اُنھیں چھوڑ کر جا سکتا ہے۔

جزا و سزا

یہ آخری مرحلہ ہے۔ اِس میں آسمان کی عدالت زمین پر قائم ہوتی ہے، خدا کی دینونت کا ظہور ہوتا ہے اور

۷۔ ہود ۱۱: ۷۴-۷۶۔

۸۔ الصّٰفّٰت ۳۷: ۱۳۹-۱۴۸۔

پیغمبر کی قوم کے لیے ایک قیامت صغریٰ برپا ہو جاتی ہے۔ پیغمبروں کے انذار کی جو تاریخ قرآن میں بیان ہوئی ہے، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس موقع پر بالعموم دو ہی صورتیں پیش آتی ہیں: ایک یہ کہ پیغمبر کے ساتھی بھی تعداد میں بہت کم ہوتے ہیں اور اُسے کوئی دارالہجرت بھی میسر نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ وہ معتد بہ تعداد میں اپنے ساتھیوں کو لے کر نکلتا ہے اور اُس کے نکلنے سے پہلے ہی کسی سرزمین میں اللہ تعالیٰ اُس کے لیے آزادی اور تمکن کے ساتھ رہنے بسنے کا سامان کر دیتے ہیں۔ اِن دونوں ہی صورتوں میں رسولوں سے متعلق خدا کی وہ سنت لازماً روبہ عمل ہو جاتی ہے جو قرآن میں اِس طرح بیان ہوئی ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اُولٰٓئِكَ فِي الْاَذَلِّيْنَ. كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ. (المجادلہ ۵۸: ۲۰-۲۱)

”بے شک، وہ لوگ جو اللہ اور اُس کے رسول کی مخالفت کر رہے ہیں، وہی ذلیل ہوں گے۔ اللہ نے لکھ رکھا ہے کہ میں غالب رہوں گا اور میرے رسول بھی۔ بے شک، اللہ قوی ہے، بڑا زبردست ہے۔“

پہلی صورت میں رسول کے قوم کو چھوڑنے کے بعد یہ ذلت اِس طرح مسلط کی جاتی ہے کہ آسمان کی فوجیں نازل ہوتیں، ساف و حاصب کا طوفان اٹھتا اور ابر و باد کے لشکر قوم پر اِس طرح حملہ آور ہو جاتے ہیں کہ رسول کے مخالفین میں سے کوئی بھی زمین پر باقی نہیں رہتا۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم نوح، قوم لوط، قوم صالح، قوم شعیب اور اِس طرح کی بعض دوسری اقوام کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا۔ اِس سے مستثنیٰ صرف بنی اسرائیل رہے جن کے اصلاً توحید ہی سے وابستہ ہونے کی وجہ سے سیدنا مسیح علیہ السلام کے اُن کو چھوڑنے کے بعد اُن کی ہلاکت کے بجائے ہمیشہ کے لیے مغلوبیت کا عذاب اُن پر مسلط کر دیا گیا۔

دوسری صورت میں عذاب کا یہ فیصلہ رسول اور اُس کے ساتھیوں کی تلواروں کے ذریعے سے نافذ کیا جاتا ہے۔ اِس صورت میں، ظاہر ہے کہ قوم کو کچھ مہلت مل جاتی ہے۔ رسول اِس عرصے میں دارالہجرت کے مخاطبین پر اتمام حجت بھی کرتا ہے، اپنے اوپر ایمان لانے والوں کی تربیت اور تطہیر و تزکیہ کے بعد اُنھیں اِس معرکۂ حق و باطل کے لیے منظم بھی کرتا ہے اور دارالہجرت میں اپنا اقتدار بھی اِس قدر مستحکم کر لیتا ہے کہ اُس کی مدد سے وہ منکرین کے استیصال اور اہل حق کی سرفرازی کا یہ معرکہ سر کر سکے۔ اِس سارے عمل کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ رسول کے مخالفین اور موافقین بالکل ممیز ہو کر اِس طرح سامنے آ جاتے ہیں کہ سنت الٰہی کے مطابق

فیصلے سے پہلے ہر گروہ کو اُس کی تمام تر خصوصیات کے ساتھ بالکل الگ دیکھ لیا جا سکتا ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ فریقین میں بالعموم تین ہی قسم کے لوگ ہوتے ہیں: مخالفین میں معاندین، متربصین اور مغفلین اور موافقین میں سابقین اولین، متبعین بالاحسان اور ضعفا و منافقین۔

''معاندین'' سے مراد وہ لوگ ہیں جو دعوت کے موثر ہوتے ہی بالکل کھلم کھلا اور پوری شدت کے ساتھ اُس کے مقابلے میں آ کھڑے ہوتے ہیں۔ اُن کی اِس مخالفت کا محرک حمیت جاہلی بھی ہوتی ہے، حسد و تکبر بھی اور مفاد پرستی بھی۔ یہ تینوں محرکات مخالفت کی نوعیت کے لحاظ سے یکساں، لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار سے بالکل الگ الگ ہیں۔

پہلا محرک بالعموم اُن لوگوں کو مقابلے پر لاتا ہے جو اپنے زمانے کی جاہلیت کے ساتھ پوری طرح مخلص اور اُس کے نظام کے سچے خادم ہوتے ہیں۔ وہ پیغمبر کی دعوت کو اپنے نظام اور اُس کے پس منظر میں موجود اپنے آبا کی روایات کے لیے ایک چیلنج سمجھ کر اُس کے مقابلے میں آتے ہیں۔ اُن کی یہ مخالفت چونکہ قومی حمیت پر مبنی ہوتی ہے، اِس وجہ سے اُس میں رذالت اور کمینگی نہیں ہوتی۔ چنانچہ یہ اگر مخالف رہتے ہیں تو ابو جہل کی طرح قوم پرستی کے پورے ولولے کے ساتھ مخالف رہتے اور اگر ایمان لاتے ہیں تو حضرت عمر اور حضرت حمزہ کی طرح پورے دل اور پوری جان سے ایمان لاتے ہیں۔

دوسرا محرک عموماً اُن لوگوں کو معاندت پر ابھارتا ہے جو وقت کے نظام میں نسلاً بعد نسلٍ دینی یا دنیوی ریاست کے مالک چلے آ رہے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ سرداری اور پیشوائی کے ایسے عادی ہو جاتے ہیں کہ پھر کسی پیغمبر کو بھی اپنا سردار اور پیشوا ماننا اُن کے لیے ممکن نہیں ہوتا اور وہ حق کو بھی لازماً اپنا پیرو بنا کر رکھنا چاہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہی لوگ تھے جنھوں نے کہا کہ اگر اللہ کو اپنی ہدایت نازل کرنا تھی تو یہ طائف اور ام القریٰ کے کسی بڑے سردار پر کیوں نازل نہ ہوئی۔[9] یہود نے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اِسی محرک کے تحت کی۔[10] حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانے میں بنی اسرائیل کے مذہبی پیشوا، فقیہ اور فریسی اِسی بنا پر ایمان کی نعمت سے محروم رہے اور آں جناب کی یہ بات اُن پر پوری طرح صادق آئی کہ اونٹ کا

۹۔ الزخرف ۴۳: ۳۱۔

۱۰۔ البقرہ ۲: ۱۰۹۔

سوئی کے ناکے میں سے نکل جانااِس سے آسان ہے کہ دولت مند خدا کی بادشاہی میں داخل ہو۔"اِس طرح کے لوگ شروع شروع میں پیغمبر اور اُس کی دعوت، دونوں کو حقیر سمجھ کر اُس سے بالکل صرف نظر کیے رہتے ہیں، لیکن جب دیکھتے ہیں کہ اُس کا اثر لوگوں میں بڑھ رہا ہے تو حسد کی آگ میں جل اٹھتے اور وہ سب کچھ کر گزرتے ہیں جو حاسدین اِس دنیا میں اپنے مخالفین کے خلاف کرتے رہے ہیں۔

تیسرا محرک عام طور پر اُن لوگوں کو آمادۂ مخالفت کرتا ہے جو اپنے ذاتی مفادات سے آگے کسی چیز کو دیکھنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوتے۔ وہ ہر معاملے میں اپنی ذات کے اسیر، ہر قدم پر استحقاق کے طالب اور ہر شے کے حق و باطل کا فیصلہ اپنی ذات کے حوالے سے کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ چنانچہ اپنی اِس اخلاقی پستی اور دنائت کی وجہ سے وہ بس اپنے مفادات ہی کی طرف لپک سکتے ہیں، پیغمبر کی دعوت کو قبول کرنا اور اُس کے عقبات سے گزرنا اُن کے لیے کسی طرح ممکن نہیں ہوتا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مقابلے میں ابولہب کا رویہ اِسی کی مثال ہے۔

"متربصین" سے مراد وہ لوگ ہیں جن پر پیغمبر کی دعوت کا حق ہونا تو کسی حد تک واضح ہوتا ہے، لیکن وہ حق کو مجرد حق کی بنیاد پر ماننے کے بجائے اِس انتظار میں رہتے ہیں کہ دیکھیں، مستقبل اِس دعوت کے بارے میں کیا فیصلہ سناتا ہے۔ چنانچہ پیغمبر کے مقابلے میں یہ زیادہ سرگرمی تو نہیں دکھاتے، لیکن ساتھ ہمیشہ مخالفین ہی کا دیتے ہیں اور شب و روز اِسی کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ حق و باطل میں سمجھوتے کی کوئی صورت پیدا ہو جائے، اور اِن کو اِس معاملے میں کوئی فیصلہ کرنے کی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔ آزمایش اور کشمکش کے زمانے میں یہ پیغمبر کے حق میں کوئی کلمۂ خیر بھی کہہ سکتے ہیں، اُس کے بارے میں کبھی اپنی پسندیدگی بھی ظاہر کر سکتے ہیں، اپنے دل میں اُس کی کامیابی کے متمنی بھی ہو سکتے ہیں اور کبھی اُس کی مالی یا اخلاقی مدد کا حوصلہ بھی کر سکتے ہیں، لیکن اِس زمانے میں اُسے ماننا اور اُس کے لیے جوکھم برداشت کر لینے پر آمادہ ہو جانا، اِن کے لیے کسی طرح ممکن نہیں ہوتا۔

"مغفلین" سے مراد وہ عوام الناس ہیں جو ذہنی اور معاشی لحاظ سے اپنے وقت کے نظام کے تابع اور ہر معاملے میں اپنے زمانے کے مذہبی پیشواؤں اور سیاسی رہنماؤں کے پیرو ہوتے ہیں۔ چنانچہ پیغمبر کی دعوت کے معاملے میں بھی یہ اُنھی کے اشاروں پر چلتے اور اُنھی کی طرف سے کسی اقدام کے منتظر رہتے ہیں۔ پہلے مرحلے

۱۱۔ متی ۱۹، آیت ۲۴۔

میں اِن کا طرزِ عمل عموماً یہی ہوتا ہے، لیکن اِس کے بعد جب اِن کے پیشوا پیغمبر کی مخالفت میں خم ٹھونک کر میدان میں اترتے ہیں تو علم و استدلال اور سیرت و اخلاق کے اعتبار سے جو فرق اِن کے لیڈروں اور پیغمبر میں ہوتا ہے، وہ بالکل نمایاں ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اُس وقت یہ اپنے لیڈروں سے بدگمان ہو کر اُن سے ٹوٹتے اور پیغمبر کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ اِن کے اندر یہ تبدیلی اِن میں سے بعض جرأت منداور اونچی سیرت کے لوگوں کو اقدام پر آمادہ کرتی ہے اور اِس کے نتیجے میں یکے بعد دیگرے یہ پیغمبر سے وابستہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔

''سابقین اولین'' کی اصطلاح قرآن مجید میں اُن لوگوں کے لیے استعمال ہوئی ہے جو کسی دعوت حق کو سنتے ہی اُس کی طرف لپکتے ہیں اور ہر نتیجے سے بے پروا ہو کر اپنا سب کچھ اُس کے لیے قربان کر دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی فطرت صالح، عقل بیدار، دل زندہ، آنکھیں بینا، کان شنوا اور دماغ ہر صحیح بات کو سمجھنے اور قبول کر لینے کے لیے پوری طرح تیار ہوتا ہے۔ یہ چیزوں کو عقل و فطرت کی روشنی میں دیکھتے اور جب اُن کی صحت پر مطمئن ہو جاتے ہیں تو ہر طرح کے جذبات و تعصبات سے بلند اور تمام خطرات سے بے خوف ہو کر بر ملا اُن کا اعتراف و اقرار کر لیتے ہیں۔ یہ سیرت و کردار کے لحاظ سے اپنی قوم میں گل سرسبد اور اپنی سرزمین پر ہمالہ و الوند کی طرح نمایاں ہوتے ہیں۔ دعوت حق اِن کے لیے کوئی اجنبی چیز نہیں ہوتی، بلکہ اِن کے دل کی آواز، اِن کے ضمیر کی صدا اور اِن کی روح کا نغمہ ہوتی ہے، اور یہ بس منتظر ہی ہوتے ہیں کہ کوئی اٹھے اور یہ اُس کا ساتھ دینے کے لیے اپنے سارے دل اور ساری جان کے ساتھ اُس کی خدمت میں حاضر ہو جائیں۔ چنانچہ پیغمبر جب اپنی دعوت کی صدا بلند کرتا ہے تو یہ نہ عذر تراشتے ہیں، نہ اُس کا حسب و نسب دیکھتے ہیں، نہ ماضی و حال کا تجزیہ کرتے ہیں، نہ شخصیت کے بخیے ادھیڑتے ہیں، نہ معجزے طلب کرتے ہیں، نہ حجتیں کھڑی کرتے ہیں اور نہ لاطائل بحثیں کرتے ہیں، بلکہ فوراً یہ کہتے ہوئے کہ: میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے ـــــ اُس کی دعوت پر لبیک کہتے ہیں اور اِس عزم کے ساتھ اُس کے شانہ بہ شانہ کھڑے ہو جاتے ہیں کہ اب ہرگز پیچھے نہ ہٹیں گے:

ولو قطعوا راسی لدیک واوصالی

''متبعین باالاحسان'' وہ لوگ ہیں جو سابقین اولین کے اقدام کے بعد اُن کو دیکھ کر حق کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ یہ عقلی اور اخلاقی اعتبار سے پہلی صف کے لوگ تو نہیں ہوتے، لیکن صف دوم میں یقیناً سب سے بہتر ہوتے ہیں۔ سابقین اولین کی طرح یہ بطور خود اگر آگے نہیں بڑھتے تو اپنے پیش رووں کی جرأت و عزیمت، حق

کے لیے اُن کی سبقت اور اِس راہ کے عقبات میں اُن کی استقامت کو دیکھ کر پیچھے رہنا بھی اُن کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ دعوت حق کی عقلی اور استدلالی قوت، بے شک اِنھیں اتنا متاثر نہیں کرتی، لیکن اہل ہمت کا شوق اور اُن کی عزیمت جلد یا بدیر اِنھیں لازماً تسخیر کر لیتی ہے۔ تاہم پیغمبر کو اِن کے معاملے میں کچھ جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ چنانچہ حق کے متعلق جو شبہات خود اِن کے دل میں پیدا ہوتے ہیں اور جو دوسروں کے پیدا کرنے سے پیدا ہو سکتے ہیں، وہ سب اگر دور کر دیے جائیں اور عزم و ہمت کی کچھ مثالیں اُن کے سامنے آ جائیں تو اِن کی فطرت کا زنگ اتر جاتا ہے۔ اِس کے بعد اگر اللہ توفیق دے تو یہ پیغمبر کے ساتھی بن جاتے ہیں اور ہر آزمایش میں پورے خلوص اور حوصلے سے اُس کا ساتھ دیتے ہیں۔

''ضعفا و منافقین'' میں مشابہت محض ظاہری ہوتی ہے۔ اپنی نیت اور ارادے کے اعتبار سے یہ بالکل الگ الگ لوگ ہیں۔ چنانچہ اِن کے اوصاف و خصائص کو بھی اِسی طرح الگ الگ سمجھنا چاہیے۔

''ضعفا'' سے مراد وہ لوگ ہیں جو پیغمبر کی دعوت کو کسی نہ کسی مرحلے میں، بلکہ بعض اوقات اُس کی ابتدا ہی میں قبول کر لیتے ہیں اور اُن کی نیت بھی یہی ہوتی ہے کہ اپنی زندگی میں اُس کے تقاضے پورے کریں، لیکن قوت ارادی میں کمزوری کی وجہ سے بار بار گرتے اور اٹھتے ہیں۔ تاہم اُن کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ ہر بار جب گرتے ہیں تو توبہ و استغفار کے ذریعے سے اپنی خطاؤں کا ازالہ کرتے اور اپنا سفر ہر حال میں راہ حق ہی پر جاری رکھتے ہیں۔

''منافقین'' اِس کے برخلاف وہ لوگ ہیں جو کبھی محض عارضی تاثر کی بنا پر اور کبھی بہت سوچ سمجھ کر شرارت کے ارادے سے پیغمبر کے ساتھ آ جاتے ہیں۔ پہلی صورت میں یہ ہمیشہ 'مذبذبین بین ذلک، لا الی ھٰؤلاء ولا الی ھٰؤلاء'[12] کی تصویر بنے رہتے ہیں اور دوسری صورت میں اِن کی حیثیت اہل ایمان کی صفوں میں دشمنوں کے ایجنٹ کی ہوتی ہے۔ چنانچہ اِن کا کردار بھی وہی ہوتا ہے جس کی توقع اِس طرح کے کسی ایجنٹ سے کی جا سکتی ہے۔

پیغمبر کے مخاطبین میں موافقین اور مخالفین کے یہ دونوں فریق جب پوری طرح ممیز ہو جاتے ہیں اور پیغمبر بھی اپنے ساتھیوں کی معیت میں جنگ کے لیے تیار ہو جاتا ہے تو خدا کی عدالت اپنا فیصلہ سنا دیتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت میں یہ فیصلہ جس طرح صادر ہوا، اُس کی تفصیلات یہ ہیں:

۱۔ قریش کی قیادت میں سے تمام معاندین بدر کے موقع پر ہلاک کر دیے گئے۔ یہ صرف ابولہب تھا، جس

۱۲۔ النساء ۴: ۱۴۳۔ ''درمیان میں لٹک رہے ہیں، نہ اِدھر ہیں نہ اُدھر۔''

نے اِس عذاب سے بچنے کی کوشش کی اور جنگ میں شامل نہیں ہوا۔ قرآن اُس کے بارے میں اعلان کر چکا تھا کہ اپنے اعوان وانصار کے ساتھ اُسے بھی لازماً ہلاک ہونا ہے۔[۱۳] چنانچہ بدر میں قریش کی شکست کے سات دن بعد یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری ہو گئی اور بنی ہاشم کے اِس سردار کا عدسہ کی بیماری سے اِس طرح خاتمہ ہوا کہ مرنے کے بعد بھی تین دن تک کوئی اُس کے پاس نہ آیا۔ یہاں تک کہ اُس کی لاش سڑ گئی اور بدبو پھیلنے لگی۔ آخر کار ایک دیوار کے ساتھ رکھ کر اُس کی لاش پتھروں سے ڈھانک دی گئی۔

۲۔ احد اور احزاب میں مسلمانوں کی تطہیر و تزکیہ کے بعد مشرکین عرب کے تمام متربصین اور مغفلین کو الٹی میٹم دے دیا گیا کہ اُن کے لیے چار مہینے کی مہلت ہے۔ اِس کے بعد رسوائی کا عذاب اُن پر مسلط ہو جائے گا جس سے نکلنے کی کوئی راہ وہ اِس دنیا میں نہ پا سکیں گے۔[۱۴]

۳۔ ۹ ہجری میں حج اکبر کے موقع پر اعلان کر دیا گیا کہ حرام مہینے گزر جانے کے بعد مسلمان اِن مشرکین کو جہاں پائیں گے قتل کر دیں گے، الاّ یہ کہ وہ ایمان لائیں، نماز کا اہتمام کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ اِس سے مستثنیٰ صرف وہ لوگ ہیں جن کے ساتھ پیغمبر کے معاہدات ہیں۔ اِن معاہدات کے بارے میں ہدایت کی گئی کہ اُن کی مدت تک اُنھیں پورا کیا جائے۔ اِس کے صاف معنی یہ تھے کہ مدت پوری ہو جانے کے بعد یہ معاہدین بھی اُسی انجام کو پہنچیں گے جو مشرکین کے لیے مقدر کر دیا گیا ہے۔[۱۵]

۴۔ اہل کتاب کے تمام گروہوں کے بارے میں حکم دیا گیا کہ وہ اب جزیہ دے کر اور مسلمانوں کے زیر دست کی حیثیت سے جئیں گے۔ اُنھیں بتا دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ اگر اُنھوں نے قبول نہ کیا تو پیغمبر اور اُس کے ساتھیوں کی تلواریں اُنھیں بھی جہنم رسید کر دیں گی۔[۱۶]

۵۔ منافقین کو متنبہ کیا گیا کہ وہ اگر توبہ کر لیں تو اُن کے حق میں بہتر ہے، ورنہ اُنھیں بھی عنقریب اُسی انجام سے دوچار ہونا پڑے گا جو منکرین کے لیے مقدر رہے۔[۱۷]

۱۳۔ اللھب ۱۱۱: ۱-۳۔

۱۴۔ التوبہ ۹: ۱-۲۔

۱۵۔ التوبہ ۹: ۳-۵۔

۱۶۔ التوبہ ۹: ۲۹۔

۱۷۔ التوبہ ۹: ۷۴، ۱۰۱۔

۶۔ مخلصین میں سے جن لوگوں سے غلطی ہوئی، اُنھیں کچھ سزا دے کر معاف کر دیا گیا[۱۸] اور ضعیف مسلمانوں کو بشارت دی گئی کہ وہ اگر توبہ و اصلاح کے رویے پر قائم رہے تو توقع ہے کہ اللہ تعالیٰ اُنھیں بھی معاف فرمادیں گے۔[۱۹]

۷۔ سابقین اولین کی قیادت میں سرزمین عرب کا اقتدار اور حرم کی تولیت مسلمانوں کے سپرد کر دی گئی اور اِس طرح اللہ تعالیٰ کا وہ وعدہ پورا ہو گیا جو سورۂ نور میں اُن کے لیے بیان ہوا ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ؕ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ.(۲۴:۵۵)

’’تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے، اُن سے اللہ کا وعدہ ہے کہ اُن کو وہ اِس ملک میں اقتدار عطا فرمائے گا، جس طرح اُس نے اُن لوگوں کو اقتدار عطا فرمایا جو اُن سے پہلے گزرے اور اُن کے اُس دین کو مضبوطی سے قائم کر دے گا جو اُس نے اُن کے لیے پسند فرمایا اور اُن کے خوف کو امن میں بدل دے گا۔ وہ میری ہی عبادت کریں گے اور کسی چیز کو میرے ساتھ شریک نہ کریں گے اور جو اِس کے بعد پھر منکر ہوں گے، وہی ہیں جو نافرمان ٹھیریں گے۔‘‘

[باقی]

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

۱۸۔ التوبہ ۹: ۱۱۸۔

۱۹۔ التوبہ ۹: ۱۰۲۔

معز امجد

التزامِ جماعت ـــــ اعتراضات کا جائزہ

(۶)

''الجماعۃ'' کے اس مفہوم پر، جسے ہم نے بیان کیا ہے، مولانا وصی مظہر صاحب ندوی نے بھی بعض اعتراضات کیے ہیں۔ مولانا کے یہ اعتراضات ماہنامہ ''فاران''، مارچ ۱۹۹۶ء میں صفحہ ۳۳ پر شائع ہوئے تھے۔ اس معاملے میں مولانا محترم کے اعتراضات حسب ذیل ہیں:

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

مولانا وصی مظہر صاحب ندوی کے اعتراضات

۱۔ احادیث میں 'الجماعۃ' سے مراد صرف وہی جماعت ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمایا اور اس کے ساتھ التزام کے احکام اسی وقت تک کے لیے ہیں، جب تک یہ قائم رہے۔ جب یہ قائم ہی نہ رہے تو اس کے ساتھ التزام کے احکام بھی نافذ العمل نہ رہیں گے۔

۲۔ احادیث صحیحہ میں 'الجماعۃ' کے جو کم سے کم شرائط بیان ہوئے ہیں، جن کی موجودگی کی صورت میں کسی جماعت کو 'الجماعۃ' قرار دیا جا سکتا ہے، وہ یہ ہیں:

ا۔ یہ بغیر کسی تفریق کے تمام مسلمانوں کی 'الجماعۃ' ہو گی،

ب۔ تمام مسلمان یا کم سے کم ان کی اکثریت اس میں شامل ہو گی،

ج۔ اس کا بنیادی مقصد ''دعوت الی الخیر'' اور اس کا بنیادی پروگرام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، اقامت صلوٰۃ، ایتاے زکوٰۃ اور قیام عدل کے لیے شریعت کا نفاذ ہو گا اور

د۔اس کا صاحب اقتدار ہونا اور مسلمانوں کی اکثریت کا اسے تسلیم کر لینا ضروری ہے۔

۳۔ 'الجماعۃ' میں بگاڑ پیدا ہو جانے کی صورت میں اس کی اصلاح کی جد و جہد کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اس کے حکمرانوں کی طرف سے 'کفر بواح' کی صورت میں، بعض شرائط کے ساتھ ان کے خلاف طاقت کے استعمال کو لازم ٹھہرایا گیا ہے۔ دین میں قتال اور حکمرانوں کے خلاف طاقت کے استعمال کی صرف دو ہی صورتیں ہیں: ایک حرام یا ناجائز اور دوسری واجب۔ چنانچہ حکمرانوں کے خلاف اگر اس قسم کے اقدام کے تمام شرائط پورے ہو رہے ہوں تو پھر طاقت کا استعمال محض جائز ہی نہیں، واجب ہو جاتا ہے۔ حکمرانوں کی 'اطاعت' کے حکم میں خوش دلی کے ساتھ اطاعت کرنا شامل ہے، اس وجہ سے کافر اور کفر بواح کے مرتکب حکمرانوں کے لیے 'اطاعت' کا لفظ استعمال نہیں کیا جا سکتا۔

۴۔ دور حاضر کی مسلم حکومتیں درج ذیل وجوہ کی بنا پر 'الجماعۃ' نہیں ہیں:

ا۔ ان حکومتوں میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ، ان ممالک میں بسنے والے غیر مسلم بھی ان میں برابر کے شریک ہیں، جبکہ 'الجماعۃ' کے لفظ کا اطلاق مسلمانوں ہی کی جماعت پر ہوتا ہے،

ب۔ یہ حکومتیں جغرافیائی حد بندیوں کی بنا پر قائم ہیں۔ ان میں سے کسی میں بھی تمام مسلمانوں یا کم سے کم ان کی اکثریت کی شرکت نہیں ہے،

ج۔ جس جماعت پر 'الجماعۃ' کا اطلاق ہو سکتا ہے، وہ ساری دنیا میں ایک ہی ہو سکتی ہے۔ ایک سے زیادہ جماعتوں پر اس لفظ کا اطلاق نہیں ہو سکتا،

د۔ ان میں سے حکومت سے الگ ہو کر کسی دوسرے ملک میں چلا جانے والا شخص واجب القتل ہے اور نہ جہنمی۔

ذیل میں ہم مولانا محترم کے نکات کا جائزہ لیں گے۔

'الجماعۃ' سے مراد کیا ہے؟

سب سے پہلی بات مولانا محترم نے یہ فرمائی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی حدیثوں میں جس چیز کو 'الجماعۃ' کہا گیا ہے، اس سے مراد صرف وہی جماعت ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمایا اور اس کے التزام کے احکام بھی اسی وقت تک کے لیے ہیں، جب تک وہ جماعت قائم ہے۔ جب یہ قائم ہی نہ رہے تو پھر مولانا محترم کے نزدیک اس کے التزام کے احکام کے بھی کوئی معنی نہیں ہوں گے۔ مولانا محترم اپنی بات کو

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دراصل یہ سارے احکام (یعنی الجماعت کے التزام، امیر کی اطاعت اور خروج کی ممانعت کے احکام) اور یہ تمام ہدایات اس وقت دی تھیں، جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سربراہی میں مدینہ منورہ کے اندر مسلمانوں کی ایک بااقتدار 'الجماعت' قائم ہو گئی تھی۔ لفظ 'جماعت' جو نکرہ (Indefinite) ہونے کی صورت میں ہر جماعت کے لیے بولا جا سکتا ہے، اس پر 'ال' داخل ہونے کے بعد اس کا اطلاق صرف اس جماعت پر ہو گا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سربراہی میں قائم ہوئی تھی۔ اور اس جماعت کے ساتھ وابستہ رہنے کے جتنے احکام ہیں، وہ سب اس وقت تک کے لیے ہیں جب تک یہ جماعت قائم رہے۔ لیکن جب یہ قائم نہ رہے جیسا کہ اس وقت ہے تو التزام جماعت کے یہ سارے احکام نافذ العمل نہ سمجھے جائیں گے۔ جس طرح ہر نماز اس وقت فرض ہوتی ہے، جب اس کا وقت داخل ہو، اس سے قبل نماز کا حکم تو موجود رہتا مگر نافذ العمل نہیں ہوتا، یا جس طرح حدود اور تعزیرات کے احکام اس وقت نافذ العمل ہیں جب وہ اجتماعی نظام موجود ہو جو ان کے نفاذ پر قائم ہو، لیکن اس نظام کی عدم موجودگی میں عام مسلمان ان احکام کے مخاطب نہیں نہ ان کے مکلف ہیں۔'' (۳۴)

ہمیں مولانا محترم کی اس بات سے اتفاق ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی روایات میں 'الجماعۃ' کا لفظ اصلاً اسی نظم اجتماعی کے لیے استعمال ہوا ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں قائم فرمایا اور پھر فتح مکہ کے بعد جس کا اقتدار پورے جزیرہ نمائے عرب پر پھیل گیا، لیکن ہمارے نزدیک اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں 'الجماعۃ' کے لفظ کا اطلاق عملاً اسی نظم پر ہو سکتا تھا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفس نفیس جزیرہ نمائے عرب میں قائم فرمایا تھا۔

التزام جماعت کے حکم کی وجہ محض یہ نہیں ہے کہ یہ نظم نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمایا تھا، بلکہ، جیسا کہ اپنے اس مضمون کے پہلے حصوں میں ہم واضح کر چکے ہیں، اس کی وجہ مسلمانوں کو بد نظمی، تفرقے اور خوں ریزی سے بچانا اور اتحاد اور اتفاق کی راہ دکھانا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ خرابی جس طرح پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم کردہ نظم سے بغاوت کرنے کے نتیجے میں پیدا ہو سکتی تھی، اسی طرح کسی بھی نظم سے بغاوت کرنے کے نتیجے میں پیدا ہو سکتی ہے۔ پھر مزید یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی کسی بھی روایت میں یہ بات نقل نہیں ہوئی کہ 'تم پر الجماعت سے وابستہ رہنا اس لیے ضروری ہے، کیونکہ یہ الجماعت تمھارے پیغمبر نے قائم کی ہے'۔ اس کے برعکس جو بات آپ سے مختلف روایتوں میں نقل ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ حکمران خواہ پسندیدہ ہو یا

ناپسندیدہ، وہ خواہ عادل ہو یا غیر عادل، وہ اللہ کا فرماں بردار ہو یا فاجر و فاسق ہو، وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر چلنے والا ہو یا اس طریقے سے گریز کرنے والا ہو، تم ہر حال میں اس کی اطاعت و فرماں برداری پر جمے رہنا، الاّ یہ کہ وہ تمھیں کوئی ایسا حکم دے جس کی اطاعت سے اللہ کی نافرمانی لازم آتی ہو یا وہ کھلے اور واضح الفاظ میں اپنے کفر کا اعلان کر دے۔ ہمیں یقین ہے کہ مولانا محترم اس بات سے اتفاق کریں گے کہ جس حکمران میں یہ تمام خرابیاں موجود ہوں، اس حکمران کے قائم کردہ نظم کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا قائم کردہ نظم کسی طرح بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔

چنانچہ اس میں تو اگرچہ شبہ نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی روایات میں جس چیز کو 'الجماعت' کہا گیا ہے، وہ مسلمانوں کا وہی اجتماعی نظم ہے جس کی بنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفس نفیس ریاست مدینہ کا نظم قائم کر کے ڈالی، لیکن ان روایتوں میں مروی التزام جماعت کی ہدایت اپنی علت کے اعتبار سے صرف اسی 'الجماعت' کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مولانا محترم نے بھی اپنے مضمون میں آگے چل کر اس بات کی وضاحت فرمائی ہے کہ آج کے دور میں کسی نظم کو اگر 'الجماعت' کہا جا سکتا ہے تو اس کے لیے اس نظم میں کون کون سی خصوصیات کا ہونا ان کے نزدیک ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر التزام جماعت کا حکم فی الواقع محض اسی جماعت کے لیے ہوتا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائی تھی تو مولانا ان خصوصیات میں ایک یہ درج فرماتے کہ 'اس نظم کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمایا ہو'۔ مزید یہ کہ 'الجماعت' سے متعلق روایات میں نقل ہونے والے تمام احکام اگر فی الواقع صرف اور صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم کردہ نظم ہی سے متعلق ہوتے تو پھر مولانا محترم کا یہ سوال بالکل بے معنی ہو جاتا کہ 'کیا ہم اس جماعت کو قائم کرنے کے مکلف ہیں؟ اور اگر جماعت قائم کرنے کے مکلف ہیں تو پھر اس کا طریق کار کیا ہو گا؟'، کیونکہ ظاہر ہے کہ اس صورت میں مسلمانوں کو اس جماعت کو قائم کرنے کا ذمہ دار ٹھیرانا انھیں تکلیف ما لا یطاق دینے کے مترادف ہوتا۔

'الجماعۃ' کی کم سے کم شرائط

مولانا محترم نے دوسری بات یہ فرمائی ہے کہ کسی نظم اجتماعی کو 'جماعت المسلمین' قرار دینے کے لیے ضروری ہے کہ وہ نظم بعض شرائط پر پورا اترتا ہو۔ مولانا محترم لکھتے ہیں:

"احادیث صحیحہ سے اس الجماعت کی جو خصوصیات معلوم ہوتی ہیں، وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ یہ تمام مسلمانوں کی جماعت ہو گی، اس میں شمولیت سے کسی مسلمان کو نہ جغرافیائی حدود کی وجہ سے، نہ لسانی اور نسلی اختلاف کی بنا پر روکا جا سکے گا۔

۲۔ تمام مسلمان اس میں شامل ہوں یا کم از کم اس کو سواد اعظم کی تائید حاصل ہو۔

۳۔ اس 'الجماعت' کا بنیادی مقصد 'دعوت الی الخیر' اور اس کا اصل پروگرام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، اقامت صلٰوۃ، ایتاء زکٰوۃ اور قیام قسط و عدل کے لیے اللہ کی کتاب اور میزان (شریعت) کو نافذ کرنا ہو گا۔

۴۔... اس جماعت کا صاحب اقتدار ہونا اور مسلمانوں کی اکثریت کا اس اقتدار کو تسلیم کر لینا ہے۔"

(ص ۳۴)

ہمارے نزدیک مولانا محترم نے یہاں جو نکات بیان فرمائے ہیں، ان میں سے پہلا اور دوسرا نکتہ ہی دراصل ہمارے اور مولانا محترم کے درمیان اختلاف کا باعث ہے۔ چوتھا نکتہ تو خود مولانا ہی کے الفاظ میں ہمارے اور ان کے درمیان متفق علیہ ہے اور جہاں تک تیسرے نکتے کا تعلق ہے، اس کے بارے میں مولانا محترم ہی کی یہ رائے ہے کہ اس معاملے میں مسلمان حکمرانوں کی طرف سے اگر کوئی کمزوری ظاہر ہو، تب بھی دین کا تقاضا یہی ہے کہ عام مسلمان اپنے نظم سے وابستہ رہیں اور اس کے خلاف علم بغاوت بلند نہ کریں۔ چنانچہ الجماعت کی خصوصیات بیان کرنے کے بعد مولانا محترم لکھتے ہیں:

"واضح رہے کہ زوال و انحطاط کے عمل سے اگر ان خصوصیات میں کچھ ضعف پیدا ہو جائے، مثلاً یہ کہ دعوت الی الخیر، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، نفاذ شریعت یا قیام قسط و عدل ٹھیک معیار کے مطابق نہ رہیں تو ان کوتاہیوں کی وجہ سے اس کے الجماعت ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا، نہ اس سے علیحدہ ہونا جائز ہو گا، نہ اس کے خلاف خروج و قتال کی اجازت ہو گی۔" (۳۴)

پھر اپنے مضمون کے آخر میں مولانا محترم نے ان وجوہ کی نشان دہی بھی فرمائی ہے جن کے باعث ان کی نظر میں موجودہ مسلمان ریاستیں 'الجماعت' کہلانے کی حق دار نہیں ہیں۔ ان وجوہ میں بھی بعض دوسرے وجوہ کے ساتھ ساتھ، اوپر درج پہلی اور دوسری خصوصیت ہی کے ناپید ہونے کا مولانا نے ذکر کیا ہے، تیسری اور چوتھی شرط وہاں پر زیر بحث ہی نہیں آئی۔ چنانچہ وہاں وہ لکھتے ہیں:

"اب آخر میں واضح کرنا چاہتا ہوں کہ دور حاضر کی مسلم حکومتیں، نام نہاد جمہوری حکومتیں، آمرانہ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حکومتیں اور بادشاہتیں حسب ذیل وجوہ کی بنا پر 'الجماعت' نہیں ہیں:

... ۲۔ ان میں سے کسی حکومت میں نہ دنیا کے تمام مسلمان شریک ہیں نہ سواد اعظم۔ ان حکومتوں میں صرف ان لوگوں کو شرکت کی اجازت ہے جو مخصوص جغرافیائی حد کے اندر رہتے ہوں، اس سے باہر رہنے والا کوئی مسلمان محض مسلمان ہونے کی بنا پر اس 'الجماعت' میں شریک نہیں ہو سکتا جو سراسر الجماعت کے بنیادی تصور کے خلاف ہے۔...

۳۔ احادیث صحیحہ کی رو سے، نیز خود لفظ 'الجماعت' سے واضح ہے کہ مسلمانوں کی 'الجماعت' سارے عالم میں بس ایک ہی جماعت ہو سکتی ہے۔ بیک وقت کئی الجماعتوں کا وجود تناقض فی الاصطلاح ہے۔ نیز اس سے لازم آتا ہے کہ ایک حکومت میں رہنے والا مسلمان 'الجماعت' میں شامل ہونے کی وجہ سے الجماعت میں شمولیت کی بشارتوں کا بھی مستحق ہو اور دوسری الجماعتوں میں شامل نہ ہونے کی وجہ سے وعیدوں کا مستحق بھی۔'' (ص ۳۵)

اس صورت حال کے پیش نظر ہمارے نزدیک مناسب ہو گا کہ ہم مولانا محترم کے پہلے دو نکات کو اچھی طرح سے سمجھ کر ان کا جائزہ لے لیں۔

مولانا کا پہلا نکتہ یہ ہے کہ 'الجماعۃ' مسلمانوں کے اسی نظم اجتماعی کو کہا جا سکتا ہے جس میں رنگ و نسل اور لسانی و جغرافیائی حدود کی تفریق کے بغیر دنیا کے تمام مسلمان شامل ہوں، دنیا کے بعض مسلمانوں کو اگر اس نظم میں شریک ہونے اور اس کا حصہ بننے کی اجازت نہ ہو تو محض اس رکاوٹ کے باعث، وہ نظم 'الجماعۃ' کہلانے کا مستحق نہ رہے گا۔

اس ضمن میں مولانا محترم سے ہم صرف یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ دین و شریعت کی نصوص میں ان کی اس بات کی دلیل کیا ہے؟ مولانا محترم سے ہماری گزارش ہے کہ وہ یہ بھی واضح فرما دیں کہ اگر مسلمان ریاست شہریوں کو تبادلے اور آمد و رفت کے معاملے میں کچھ بین الاقوامی معاہدات میں بندھی ہوئی یا اپنے تحفظ کے لیے آنے والوں پر کچھ پابندیاں اور شرائط عائد کرتی ہو تو کیا اس صورت میں وہ 'الجماعۃ' یا بہ الفاظ دیگر 'مسلمانوں کا نظم اجتماعی' کہلانے کی مستحق نہیں رہے گی؟ مولانا کے نزدیک اگر ایسی ریاست 'الجماعۃ' یا 'مسلمانوں کا نظم اجتماعی' کہلانے کی مستحق نہیں رہتی تو پھر مولانا سے ہماری گزارش ہے کہ وہ یہ واضح فرما دیں کہ ان کے نزدیک محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سربراہی میں مدینہ کی ریاست، صلح حدیبیہ کے بعد کس اصول پر 'الجماعۃ' کہلانے کی

مستحق ہوئی؟ یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ صلح حدیبیہ کے جس معاہدے پر اللہ کے پیغمبر نے 'جماعت المسلمین' کے سربراہ کی حیثیت سے اپنی مہر ثبت فرمائی تھی، اس کی ایک شق یہ بھی تھی کہ مکہ کا کوئی باشندہ اگر مسلمان ہو کر مدینہ آئے تو مسلمان اسے واپس کرنے کے پابند ہوں گے۔ ظاہر ہے، اس بات کے معنی ہی یہ ہیں کہ ایسے شخص کو ریاست مدینہ کی شہریت نہیں دی جا سکتی۔ گویا اس زمانے میں ایک بین الاقوامی معاہدے کی وجہ سے خود ریاست مدینہ سے 'باہر رہنے والا کوئی مسلمان محض مسلمان ہونے کی بنا پر اس الجماعت میں شریک نہیں ہو سکتا' تھا اور یہ بات مولانا محترم کے نزدیک 'سراسر الجماعت کے بنیادی تصور کے خلاف ہے'۔ چنانچہ تاریخ و سیر کے اوراق ہمیں بتاتے ہیں کہ اسی معاہدے کی پابندی کرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو جندل رضی اللہ عنہ اور ابو بصیر کو مدینہ کی شہریت نہیں دی اور انھیں مکہ والوں کو لوٹا دیا۔ اب اگر مولانا محترم کی بات صحیح ہے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ریاست مدینہ کو کس اصول پر 'الجماعۃ' یا 'جماعت المسلمین' قرار دیا جا سکتا ہے۔

مولانا محترم کا دوسرا نکتہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا صرف وہی نظم 'الجماعۃ' کہلائے گا جس میں تمام مسلمان شامل ہوں یا جسے تمام مسلمانوں کے سواد اعظم، یعنی ان کی اکثریت کی تائید حاصل ہو۔ 'تمام مسلمانوں' سے مولانا کی مراد اگر 'ایک نظم اور ایک ریاست میں رہنے والے تمام مسلمان' ہیں تو پھر ہمیں مولانا محترم کی اس بات سے بہت حد تک اتفاق ہے، لیکن اس سے مراد اگر 'دنیا کے تمام مسلمان' ہیں تو اس معاملے میں بھی ہم مولانا محترم سے گزارش کریں گے کہ وہ ہمیں ان نصوص سے آگاہ فرمادیں جن کی بنیاد پر انھوں نے یہ فتویٰ دیا ہے۔ مزید یہ کہ اگر کسی نظم کو 'الجماعۃ' کہلانے کے لیے یہ لازم ہے کہ دنیا کے تمام مسلمان اس میں شامل ہوں تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ریاست مدینہ قائم ہو جانے کے بعد بھی مکہ میں رہ جانے والے مسلمانوں کو چھوڑ کر عام طور پر کسی کو مدینہ منتقل ہونے کا حکم آخر کیوں نہیں دیا گیا؟ تاریخ و حدیث کی کتابوں میں ایسے بہت سے واقعات نقل ہوئے ہیں جن کے مطابق لوگ مدینہ آکر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتے اور پھر دین کی ضروری تعلیمات حاصل کر کے واپس اپنے اپنے علاقوں میں چلے جاتے، مگر عام طور پر ان کو یہ نہیں کہا جاتا تھا کہ ان پر مدینہ منتقل ہونا لازم ہے۔

اسی طرح مولانا محترم سے ہماری گزارش ہے کہ وہ یہ بھی واضح فرمادیں کہ اگر کبھی خدانخواستہ مسلمانوں کی اکثریت مغربی طاقتوں کے آگے سیاسی طور پر مغلوب ہو جائے (جیسا کہ تاریخ میں ہو چکا ہے) اور صرف سعودی عرب ہی ایک ایسا علاقہ رہ جائے جہاں مسلمانوں کی حکومت قائم ہو تو کیا مولانا کے نزدیک محض اس وجہ سے کہ

سعودی عرب میں دنیا کے تمام مسلمان یا ان کا سواد اعظم شامل نہیں ہے، وہ ریاست 'الجماعۃ' کہلانے کی مستحق نہیں ہو گی؟

ہمارے نزدیک، جیسا کہ ہم بار بار واضح کرتے آرہے ہیں، اصل بات یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب 'التزام جماعت' کے حکم کے معنی یہ ہیں کہ کسی علاقے میں بسنے والے مسلمان جب اپنا کوئی نظم اجتماعی بنالیں تو پھر اس نظم سے جڑ کر رہا جائے اور اس کی وفاداری کی جائے۔ جس طرح کسی نظم اجتماعی کی موجودگی کے لیے ضروری اور لازمی شرط یہی اور بس یہی ہے کہ اس نظم اجتماعی کا وجود فی الواقع موجود ہو، اس کے لیے یہ بات کسی طرح بھی ضروری قرار نہیں دی جاسکتی کہ وہ 'دنیا کے تمام لوگوں' یا 'تمام مسلمانوں' یا 'تمام یہودیوں' کا نظم ہو، اسی طرح 'الجماعۃ' کے وجود کی بھی تنہا شرط یہی ہے کہ وہ موجود ہو۔ اس علاقے کے مسلمان باہمی طور پر متحارب گروہوں میں بٹ نہ چکے ہوں۔ ایسی صورت حال نہ پیدا ہو چکی ہو جس میں یہ کہنا مشکل ہو جائے کہ اس علاقے کے مسلمانوں کا امیر کون ہے۔

اس ضمن میں آخری بات یہ ہے کہ اگر اس وقت فی الواقع مولانا کے نزدیک 'الجماعت' کا کوئی وجود نہیں ہے تو پھر وہ تمام باہمی طور پر متحارب گروہوں سے الگ ہو کر کسی جنگل میں جا کر زندگی گزارنے کا درس کیوں نہیں دیتے۔ یہ واضح رہے کہ 'الجماعۃ' کی غیر موجودگی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت یہ نہیں ہے کہ ہم:

"۱۔ مشرکین (ہر طرح کے مشرکین) کی پروا کیے بغیر توحید خالص کی صاف صاف دعوت دیں۔

۲۔ عقیدۂ آخرت کو غیر موثر بنادینے والے تمام تصورات کی نفی کرتے ہوئے ایمان بالآخرت کی طرف بلائیں۔

۳۔ ایمان بالرسالت اور ایمان بالکتاب کی دعوت دیں۔

۴۔ توبہ (رجوع الی اللہ) اور استغفار کی دعوت دیں۔" (ماہنامہ فاران، مارچ ۱۹۹۶ء، ص ۳۴)

اس صورت حال میں آپ کی ہدایت یہ ہے کہ اپنے ایمان کی خیر منائی جائے اور ہر قسم کی گروہی وابستگی سے الگ رہتے ہوئے کسی جنگل میں جا کر زندگی گزار دی جائے۔

ہمیں یقین ہے کہ مولانا محترم ہمارے اس سوال کا جواب یہ دیں گے کہ مسلمان اس وقت اللہ کی مہربانی سے باہمی طور پر متحارب گروہوں میں تقسیم ہی نہیں ہیں، بلکہ بہت حد تک ایک منظم ریاست کے شہری ہیں، اس وجہ سے 'باہمی طور پر متحارب گروہوں سے الگ ہو کر کسی جنگل میں جا کر زندگی گزارنے' کا سوال ہی نہیں

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ہے۔ ہماری بھی یہی رائے ہے۔ اور یہی صورت حال اس بات کی دلیل ہے کہ پاکستان کے مسلمان ہوں یا دنیا کے کسی اور ملک کے مسلمان، وہ سب اپنے اپنے علاقے کے نظم سے وابستہ زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ نظم خواہ کتنے ہی بگڑے ہوئے کیوں نہ ہوں، مگر یہی نظم ان مسلمانوں کے لیے اپنے اپنے علاقے میں 'الجماعۃ' کی حیثیت رکھتے ہیں۔

'الجماعۃ' میں بگاڑ کا علاج

مولانا محترم نے تیسری بات یہ فرمائی ہے کہ 'الجماعۃ' میں بگاڑ کی صورت میں مسلمانوں کو اس کی اصلاح کا حکم دیا گیا ہے اور حکمران اگر کفر بواح کے مرتکب ہوں تو بعض شرائط پورے ہونے کے بعد، ان کے خلاف جہاد کو مسلمانوں پر لازم ٹھہرایا گیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"کفر بواح کے ارتکاب کے بعد، کوئی اقتدار 'الجماعت' باقی نہیں رہتا ایسے اقتدار کے ساتھ مومن کا اصل تعلق محاربہ کا ہوتا ہے۔ اگر عملاً محاربہ کرنے کے لیے اسلام نے چند اہم شرائط عائد کر دی ہیں جن کے بغیر نہ کفر بواح کے مرتکب نام نہاد مسلمانوں کے خلاف طاقت استعمال کی جا سکتی ہے، نہ کافر حکمرانوں کے خلاف۔ کافر حکمرانوں اور کفر بواح کے مرتکب نام نہاد مسلمانوں کے مابین کوئی فرق نہیں ہے۔ جب بھی کسی بااختیار امیر کی قیادت میں مسلمانوں کی کوئی جماعت وجود میں آ جائے اور اس کے پاس اتنی مادی طاقت بھی فراہم ہو جائے کہ کافرانہ حکومت کو کامیابی کے ساتھ ہٹانے کے واضح امکانات نظر آ رہے ہوں تو ان کے خلاف محاربہ صرف جائز ہی نہیں بلکہ محاربہ واجب ہے۔ 'وقاتلوهم حتى لا تكون فتنة ويكون الدين لله' (اور ان سے جنگ کرو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور اطاعت (صرف) اللہ کے لیے ہو جائے)۔"

(ص ۳۴-۳۵)

احکام دین کے استنباط کے حوالے سے ہماری رائے یہ ہے کہ جب تک قرآن و سنت کی واضح نصوص موجود نہ ہوں، اس وقت تک معاملات میں سے کسی چیز کو واجب یا حرام قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جب تک ایسی واضح نصوص موجود نہ ہوں جو کسی معاملے کو مسلمانوں پر لازم یا ان کے لیے ممنوع قرار دے رہی ہوں، اس وقت تک اس معاملے کو جائز یا ناپسندیدہ تو قرار دیا جا سکتا ہے، فرض و واجب یا حرام و ممنوع قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اپنی اسی رائے کی وجہ سے ہم اپنے آپ کو یہ کہنے پر مجبور پاتے ہیں کہ کفر بواح کے ارتکاب کے باوجود حکمرانوں کے خلاف خروج و بغاوت یا کسی قسم کا کوئی اقدام، زیادہ سے زیادہ جائز ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کے اقدام کو

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

فرض یا واجب قرار دینے کی واضح نصوص موجود ہی نہیں ہیں۔

مولانا محترم نے اپنی اس بات کے آخر میں قرآن مجید کے جن الفاظ کا حوالہ دیا ہے، وہ سورۂ بقرہ (آیت ۱۹۳) اور سورۂ انفال (آیت ۳۹) میں آئے ہیں۔ ان دونوں ہی مقامات پر غور کرنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہاں دراصل جن لوگوں سے جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے، وہ کفر بواح کے مرتکب 'نام نہاد مسلمان' حکمران نہیں، بلکہ قریش کے وہ کفار ہیں جن کے لیے رسولوں کے باب میں اللہ تعالیٰ کی سنت کے مطابق اب 'فی الاذلین' (ذلیل و رسوا) ہونا مقدر ہو چکا ہوا تھا۔ اس سیاق میں دیکھیے تو اس آیت کا کوئی تعلق 'نام نہاد مسلمان' حکمرانوں کے خلاف کسی کارروائی سے نہیں ہے۔ سورۂ بقرہ میں یہ الفاظ جس سیاق و سباق میں آئے ہیں، پہلے انھیں ملاحظہ فرمایئے۔ ارشاد ہے:

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ط اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ. وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ج وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ج فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ط كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ. فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ. وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ.(۲: ۱۹۰-۱۹۳)

"اور تم لوگ اللہ کی راہ میں ان سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں، مگر حد سے بڑھنے والے نہ بنو۔ بے شک، اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور انھیں جہاں کہیں پاؤ، قتل کرو اور جہاں سے انھوں نے تمھیں نکالا ہے، وہاں سے انھیں نکال باہر کرو۔ اور فتنہ قتل سے بڑھ کر ہے۔ اور تم ان سے مسجد حرام کے پاس مت لڑو، جب تک وہ خود تم سے اس (کے حدود) میں جنگ نہ چھیڑیں۔ چنانچہ وہ اگر تم سے (اس کے حدود میں) لڑیں تو تم بھی ان سے لڑو۔ یہی ان کافروں کا بدلہ ہے۔ پھر اگر وہ باز آجائیں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور ان سے لڑو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہ جائے اور دین اللہ کا ہو جائے۔"

جہاں تک سورۂ انفال کا تعلق ہے، وہ تو پوری سورہ ہی قریش کے خلاف کارروائی کی تیاری کے احکام دے رہی ہے۔ اسی سیاق میں وہ عبارت بھی آئی ہے جس کا مولانا محترم نے حوالہ دیا ہے۔

مولانا محترم سے ہماری گزارش ہے کہ وہ ہمارے لیے ان نصوص کی نشان دہی فرمادیں جن کی بنیاد پر وہ کفر بواح کے مرتکب حکمرانوں کے خلاف جنگ و قتال کو 'واجب' قرار دیتے ہیں۔ مولانا محترم لکھتے ہیں:

"...فرض کریں کہ

ا۔ حکومت کفر بواح کی مرتکب ہے۔

ب۔ مسلمان ایک بااختیار امیر کے تحت منظم ہیں۔

ج۔ مسلمان تعداد اور وسائل کے لحاظ سے کفر بواح کی مرتکب حکومت کو ہٹانے کی نظر بظاہر صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔

تو کیا اس صورت میں یہ جائز ہو گا کہ وہ 'کفر بواح' کی مرتکب حکومت کو ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کے مصداق دیکھتے رہیں اور کچھ نہ کہیں؟" (ص ۳۵)

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

ہم مولانا محترم کو یاد دلانا چاہتے ہیں کہ سوال یہ نہیں ہے کہ ایسی صورت حال میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا جائز ہے یا نہیں، سوال تو یہ ہے کہ ایسی صورت حال میں مسلمان حکمرانوں کے خلاف تلوار اٹھانا دین و شریعت نے لازم ٹھہرایا ہے یا نہیں۔ مولانا محترم یقیناً ہم سے بہتر جانتے ہیں کہ جو شخص ایسی صورت حال میں 'نام نہاد مسلمان' حکمرانوں کے خلاف تلوار اٹھانے کو لازم، فرض یا واجب سمجھتا ہے، اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ قرآن و سنت کی وہ نصوص پیش کرے جن سے اس قسم کے اقدام کا لازم، فرض یا واجب ہونا ثابت ہوتا ہو۔ ایسی نصوص کی غیر موجودگی میں کسی چیز کو دین میں لازم، فرض یا واجب قرار دینا بیان شریعت نہیں ہے۔ اور یقیناً مولانا محترم ہم سے اتفاق کریں گے کہ اہل علم کا کام شریعت سازی نہیں، بیان شریعت ہی ہونا چاہیے۔

مولانا محترم لکھتے ہیں:

"اس موقع پر یاد رکھنا چاہیے کہ 'اطاعت' کے مفہوم میں خوش دلی کے ساتھ حکم کی بجاآوری کا تصور پایا جاتا ہے اور احکام کی اس طرح سے بجاآوری اللہ تعالیٰ کے بعد رسول اور ان اولوالامر کے ساتھ مخصوص ہے جو مسلمانوں میں سے ہوں۔ کافر اور کفر بواح کے مرتکب حکمرانوں کے لیے اطاعت کا لفظ استعمال نہیں کیا جا سکتا۔" (ص ۳۵)

مولانا محترم سے ہماری گزارش ہے کہ وہ زبان کے ان شواہد سے ہمیں مطلع فرمائیں جن کی بنیاد پر ان کے نزدیک خوش دلی اور دل کی آمادگی کے بغیر کسی کے حکم کو مان لینے پر عربی زبان میں لفظ 'اطاعت' نہیں بولا جاتا۔

اس حوالے سے مولانا محترم سے گزارش ہے کہ وہ روایات میں نقل ہونے والے ان حالات کو خاص طور پر سامنے رکھیں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے امیر کی 'اطاعت' کا حکم دیا ہے اور یہ بتائیں کہ ان کے اپنے بیان کردہ اصول کے مطابق ان حالات میں 'خوش دلی کے ساتھ حکم کی بجاآوری' کس طرح مراد لی جاسکتی ہے؟ مثال کے طور پر مسلم کی ایک روایت کے مطابق ایک صحابی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اگر حکمران اپنے حقوق تو ہم سے لے لیں، مگر ہمارے حقوق ادا نہ کریں (یعنی وہ ذمہ داریاں ادا نہ کریں جو دین و شریعت اور عقل و فطرت کی رو سے مسلمان عوام کے حوالے سے ان پر عائد ہوتی ہیں) تو اس صورت میں ہم کیا کریں؟ اس کے جواب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: 'اسمعوا واطیعوا' (ان کی بات سننا اور ان کی اطاعت کرنا)۔ ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں حکمران کی اطاعت خوش دلی اور دل کی آمادگی کے ساتھ کسی طرح بھی نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح وہ روایت جس میں کفر بواح کے بعد حکمرانوں کے خلاف خروج کے جواز کا استنباط کیا جاتا ہے، خود اس کے الفاظ یہ بات واضح کر رہے ہیں کہ لفظ 'اطاعت' محض حکم کی بجاآوری کے لیے آتا ہے، اس میں خوش دلی اور دل کی آمادگی کی شرط کسی طرح نہیں لگائی جاسکتی۔ روایت کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

فیما أخذ علینا أن بایعنا علی السمع والطاعة فی منشطنا ومکرهنا وعسرنا ویسرنا وأثرة علینا. (بخاری، کتاب الفتن)	''آپ نے ہم سے جن باتوں کا اقرار لیا، ان میں یہ بھی تھی کہ ہم سنیں گے اور اطاعت کریں گے، خواہ پسند ہو یا ناپسند، تنگی ہو یا کشادگی اور خواہ ہم پر دوسروں کو ترجیح ہی کیوں نہ دی جائے۔''

دور حاضر کی مسلم حکومتیں اور 'الجماعۃ'

مولانا محترم لکھتے ہیں:

''اب آخر میں واضح کرنا چاہتا ہوں کہ دور حاضر کی مسلم حکومتیں، نام نہاد جمہوری حکومتیں، آمرانہ حکومتیں اور بادشاہتیں حسب ذیل وجوہ کی بنا پر الجماعت نہیں ہیں:

۱۔ نام نہاد جمہوری حکومتوں میں ان ملکوں میں آباد غیر مسلم بھی برابر کے شریک ہیں، جبکہ 'الجماعت' کا اطلاق صرف مسلمانوں کی جماعت پر ہوتا ہے۔

۲۔ ان میں سے کسی حکومت میں نہ دنیا کے تمام مسلمان شریک ہیں، نہ سواد اعظم۔ ان حکومتوں میں صرف ان لوگوں کو شرکت کی اجازت ہے، جو مخصوص جغرافیائی حد کے اندر رہتے ہوں۔ اس سے باہر رہنے

والا کوئی مسلمان محض مسلمان ہونے کی بنا پر اس الجماعت میں شریک نہیں ہو سکتا جو سراسر الجماعت کے بنیادی تصور کے خلاف ہے۔

۳۔ احادیث صحیحہ کی رو سے نیز خود لفظ 'الجماعت' سے واضح ہے کہ مسلمانوں کی الجماعت سارے عالم میں بس ایک ہی جماعت ہو سکتی ہے۔ بیک وقت کئی الجماعتوں کا وجود تناقض فی الاصطلاح ہے۔ نیز اس سے لازم آتا ہے کہ ایک حکومت میں رہنے والا مسلمان 'الجماعت' میں شامل ہونے کی وجہ سے الجماعت میں شمولیت کی بشارتوں کا بھی مستحق ہو اور دوسری الجماعتوں میں شامل نہ ہونے کی وجہ سے وعیدوں کا مستحق بھی۔

۴۔ ان میں سے کسی ریاست یا حکومت سے الگ ہو کر کسی دوسرے ملک میں چلا جانے والا یا ان میں سے کسی ریاست سے اختلاف رکھنے والا کوئی شخص نہ واجب القتل ہے، نہ اس کی علیحدگی جہنم کی طرف لے جانے والی ہے، نہ اس کی موت جاہلیت کی موت ہے۔'' (ص ۳۵)

مولانا محترم کے ان نکات میں سے دوسرے اور تیسرے نکتے کا ہم پہلے تجزیہ کر چکے اور ان کے بارے میں اپنی معروضات مولانا کی خدمت میں پیش کر چکے ہیں۔ یہاں ہم پہلے اور چوتھے نکتے پر غور کریں گے۔

مولانا محترم کا پہلا نکتہ یہ ہے کہ 'الجماعت' مسلمانوں کی صرف اسی مملکت کو کہا جا سکتا ہے جس میں غیر مسلم شریک نہ ہوں۔ جس مملکت میں غیر مسلم بھی برابر کے شریک ہوں، اسے 'الجماعت' نہیں کہا جا سکتا۔

پہلے تمام نکات کی طرح مولانا کے اس نکتے کے حوالے سے بھی ان سے ہماری گزارش ہے کہ وہ ہمیں دین و شریعت کی ان واضح نصوص سے آگاہ فرما دیں جن سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ 'الجماعت' میں غیر مسلموں کی شرکت ممنوع ہے۔ ہم تو اب تک یہی سمجھتے رہے ہیں کہ جہاں تک معاہدین کا تعلق ہے، ان کے حوالے سے شریعت نے یہ آزادی دے رکھی ہے کہ ان کے ساتھ عدل و انصاف اور باہمی مصلحت کو سامنے رکھتے ہوئے جن شرائط پر بھی معاہدہ طے پا جائے گا، دونوں فریق اس معاہدے کو پورا کرنے کے پابند ہوں گے۔ اگر ہماری یہ بات صحیح نہیں ہے تو پھر مولانا ہی بتائیں کہ شریعت نے معاہدین کے کیا حقوق و فرائض متعین کیے ہیں اور دور حاضر کے 'نام نہاد' مسلمان ممالک کن کن پہلوؤں سے ان حقوق و فرائض میں کمی بیشی کے مجرم ہیں۔ مزید یہ کہ مولانا محترم مہربانی فرما کر یہ بھی واضح فرما دیں کہ اگر فی الواقع غیر مسلموں کی شرکت سے ایک ریاست 'الجماعت' کہلانے کی مستحق نہیں رہتی تو پھر میثاق مدینہ میں یہود کی دینی حیثیت کو تسلیم کرنے، ریاست کی سطح پر ان کے حقوق و فرائض کو تسلیم کرنے اور انھیں سیاسی حیثیت سے اس ریاست کا فرد قرار دینے، یہاں تک کہ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بعض حالات میں مسلمانوں کو ان کے کیے ہوئے صلح کے معاہدوں کا پابند کرنے کے بعد، مدینہ کی ریاست کس اصول پر 'الجماعت' کہلائے گی؟

مولانا محترم کا چوتھا نکتہ یہ ہے کہ چونکہ مسلمان ممالک میں سے کسی ایک کو چھوڑ کر دوسرے میں چلے جانے سے کوئی شخص واجب القتل ہوتا ہے، نہ اس عمل پر اسے جہنم کی وعید سنائی جاسکتی ہے اور نہ اس کی موت کو جاہلیت کی موت قرار دیا جاسکتا ہے، چنانچہ یہ بات اس کا واضح ثبوت ہے کہ یہ اسلامی ممالک ہوں یا ان میں بسنے والے شہری، کوئی بھی ان ممالک کو 'الجماعۃ' نہیں سمجھتا۔

ہم بڑے ادب کے ساتھ مولانا محترم سے یہ گزارش کریں گے کہ روایات میں جس چیز کو 'خرج من الطاعة' یا 'فارق الجماعة' یا 'خرج من الجماعة' کہا گیا ہے، اس سے مراد محض ایک جگہ سے منتقل ہو کر دوسری جگہ چلے جانا یا ایک ملک سے کسی دوسرے ملک کی طرف ہجرت کر جانا نہیں ہے، بلکہ جیسا کہ انھی روایتوں سے واضح ہے کہ اس سے مراد نظم کو درہم برہم کرنا، ریاست کے معاملات میں خلل ڈالنا، ریاست کے شہریوں کے جان و مال کو تلف کرنا، ریاست کے قانون کو ماننے سے انکار کرنا، ریاست کی نمائندہ حکومت کا تختہ الٹنا، غرض کہ ریاست کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا ہے۔ خاموشی کے ساتھ اور پر سکون طریقے سے ایک ملک کو چھوڑ کر کسی دوسرے ملک منتقل ہو جانے کے لیے یہ الفاظ نہیں بولے گئے۔ چنانچہ جن روایتوں میں یہ الفاظ آئے ہیں، ان پر غور کرنے سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ان سے مراد ریاست کا نظم درہم برہم کرنا ہی ہے (تفصیل کے لیے ہمارے مضمون کے پہلے حصے پر ایک نظر ڈال لیجیے) اور ہمارے علم کی حد تک موجودہ دور میں بھی تمام اسلامی ممالک میں اس قسم کے جرم کی سزا موت ہی ہے۔

مولانا محترم سے ہماری گزارش ہے کہ وہ ہماری ان معروضات پر غور فرمائیں۔ ان میں وہ اگر کوئی غلطی پائیں تو ہمیں اس سے ضرور آگاہ فرمائیں۔ ''اشراق'' کے صفحات اس معاملے میں ان کے فرمودات کی اشاعت کے لیے ہر وقت حاضر رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ صحیح باتوں کے لیے دلوں میں جگہ پیدا فرمائے اور غلط باتوں کے شر سے ہم سب کو محفوظ و مامون رکھے۔

معز امجد / محمد بلال

اللہ کہاں ہے؟

انٹر نیٹ کی دنیا کے ایک مستشرق مسٹر جوکن کاٹز (Jochen Katz) نے حسبِ روایت قرآنِ مجید پر تنقید کرتے ہوئے اس کی چند آیات کو ایک دوسرے کے ساتھ معنوی لحاظ سے متصادم قرار دیا ہے اور خدا کے مسکن کے بارے میں ایک سوال اٹھایا ہے۔ میں نے انٹرنیٹ پر "Where is Allah?" (اللہ کہاں ہے؟) کے زیرِ عنوان اس تنقید کا جواب دیا تھا۔ اب محمد بلال صاحب نے قارئینِ "اشراق" کے استفادے کے لیے میری انگریزی تحریر کو اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔

انٹر نیٹ پر مسٹر جوکن کاٹز کی اصل تحریر:

http://www. answeringislam.org/Quran/Contra/ i020.html

پر اور میری اصل تحریر:

http://www.understanding_islam.com/articles/quran/wia.htm

پر دیکھی جا سکتی ہے۔ (مدیر)

مسٹر جوکن کاٹز کی تنقید

مسٹر جوکن کاٹز اسلام پر اپنے مختلف تنقیدی مضامین میں سے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ خدا کے مسکن کے متعلق آیاتِ قرآنی باہم متضاد ہیں۔ مسٹر کاٹز اپنی اس تنقید کی بنیاد قرآنِ مجید کے حسبِ ذیل مقامات پر رکھتے ہیں:

هُوَ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ   "وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا

فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ. (الحدید۵۷:۴)

کیا چھ دنوں میں پھر وہ (قوت و اقتدار کے) عرش پر متمکن ہوا۔''

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ. (ق۵۰:۱۶)

''اور ہم اس کی رگِ جاں سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔''

وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ وَّکَانَ عَرْشُهٗ عَلَی الْمَآءِ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا. (ہود۱۱:۷)

''اور وہی ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں اور اس کا عرش پانی پر تھا تاکہ تمھیں جانچے کہ کون اچھے عمل والا ہے۔''

یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْهِ فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ. (السجدہ۳۲:۵)

''وہی آسمان سے زمین تک سارے امور کا انتظام فرماتا ہے۔ پھر یہ تمام امور اسی کی طرف لوٹتے ہیں ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمھارے شمار سے ہزار سال کے برابر ہے۔''

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِکَةُ وَالرُّوْحُ اِلَیْهِ فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَةٍ. (المعارج۷۰:۴)

''اس کی طرف فرشتے اور جبریل صعود کرتے ہیں اور ایک ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال کے برابر ہے۔''

سورۂ حدید کی آیت ۴ اور سورۂ ق کی آیت ۱۶ کا موازنہ کرتے ہوئے مسٹر کاٹز لکھتے ہیں:

''کیا خدا کا عرش تمھاری رگِ جاں پر واقع ہے؟ یہ سوال احمقانہ لگتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک آدمی ان آیات کا یہ مطلب آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ اللہ ہر شخص کے نزدیک ہے، کیونکہ وہ کسی مخصوص جگہ میں مقید نہیں ہے۔ اللہ ''ہر جگہ'' پر ہے سے مراد یہ ہے کہ کوئی جگہ اللہ کی موجودگی سے خالی نہیں ہے۔ (پھر) ''عرش'' کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟''

اس کے بعد سورۂ حدید کی آیت ۴ میں استعمال کیے گئے لفظ ''عرش'' کے مفہوم کا حوالہ دیتے ہوئے، جو عام طور پر مترجمین سمجھتے ہیں (جو اس مفہوم سے مختلف نہیں ہے جو میں نے اپنے ترجمے میں اختیار کیا ہے۔ یعنی اس کا مطلب ''کنٹرول'' بتایا ہے) مسٹر کاٹز لکھتے ہیں:

"یہ "عرش" اللہ کی حکومت اور قوت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ کوئی شخص اسے کسی مادی جگہ کا مفہوم پہنائے۔ اور در حقیقت یوسف علی[1] اس کا اس طرح ترجمہ کرتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی عرش پر عملاً براجمان ہونے کا معاملہ نہیں ہے۔ (جو کہ عربی کا لغوی مفہوم ہے) بلکہ یہ اس (اللہ) کی قوت کا استعاراتی اظہار ہے۔"

"He it is who created the heavens and the earth in Six Days, and is moreover firmly established on the throne (of Authority)."

"وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا چھ دنوں میں پھر وہ (قوت و اقتدار کے عرش پر متمکن ہوا۔"

مسٹر کاٹز مزید لکھتے ہیں:

"یہ (ترجمہ اس صورت میں) مسئلہ حل کر دے گا اگر ہر شخص اللہ کے عرش کو بیان کرتے ہوئے اسے ہمیشہ استعاراتی مفہوم میں سمجھے۔ لیکن ہم اس آیت کا کیا کریں؟

وَهُوَ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ	"اور وہی ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں اور
فِىْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ	زمین کو چھ دنوں میں اور اس کا عرش پانی پر تھا
لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا. (۱۱:۷)	تاکہ تمھیں جانچے کہ کون اچھے عمل والا ہے۔"

کیا یہاں "پانی" (کا لفظ) بھی استعاراتی (طور پر استعمال ہوا) ہے۔ حتیٰ کہ (یہاں) یہ بھی مکمل طور پر واضح نہیں کیا گیا کہ یہ پانی کہاں تھا (سمندر میں، بارش کے بادلوں میں .....)۔ (یہاں) واضح طور پر "عرش" کی جگہ کا بیان ہے۔ (اس لیے) اب (لفظ "عرش" کو) استعاراتی (مفہوم میں) نہیں لیا جا سکتا۔ (اور پھر یہاں) عربی کا فعل ماضی (استعمال ہوا) ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا عرش اب بھی پانی کے اوپر ہے۔ اور اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو پھر (یہ عرش) کہاں چلا گیا ہے؟"

اس کے بعد مسٹر کاٹز نے حسبِ ذیل آیات نقل کی ہیں:

يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ	"وہی آسمان سے زمین تک سارے امور کا
ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِىْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ	انتظام فرماتا ہے۔ پھر یہ تمام امور اسی کی طرف

[1] جناب یوسف علی نے قرآنِ مجید کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے، جو خاصا معروف ہے۔ (مترجم)

اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ. (السجدہ ۳۲:۵)

لوٹتے ہیں ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمھارے شمار سے ہزار سال کے برابر ہے۔"

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ. (المعارج ۷۰:۴)

"اس کی طرف فرشتے اور جبریل صعود کرتے ہیں اور ایک ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال کے برابر ہے۔"

اور پھر ان آیات کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"اگر اللہ ہماری رگِ جاں سے بھی زیادہ قریب ہے تو پھر ان "امور"، فرشتوں اور جبرائیل کو اس کی جانب سفر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا سورۂ سجدہ اور سورۂ معارج کی مذکورہ آیات کی کوئی ایسی تعبیر ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ اللہ اور زمین کے درمیان کوئی "مادی فاصلہ" نہیں ہے کہ جسے طے کرنے کی ضرورت ہو۔ سورۂ ق کی آیت ۱۶ سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اللہ ہر جگہ موجود ہے اور ایسی کوئی جگہ نہیں ہے جہاں سے تمھیں اپنے موجودہ مقام سے اس کے قریب ہونے کے لیے جانا پڑے۔"

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

تنقید کا جواب

مسٹر کاٹز کی تنقید بنیادی طور پر تین نکات پر مشتمل ہے۔ لہٰذا ہم تین مختلف عنوانات سے ان کے اٹھائے گئے اعتراضات کا جواب عرض کرتے ہیں۔

۱۔ خدا کا رگِ جاں کے قریب ہونا اور فرشتوں کا سفر

مسٹر کاٹز پہلا اعتراض یہ کرتے ہیں کہ سورۂ حدید کی آیت ۴ اور سورۂ ق کی آیت ۱۶ باہم متصادم ہیں۔ ایک آیت یہ کہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کی رگِ جاں سے بھی زیادہ قریب ہے تو دوسری آیت یہ کہتی ہے کہ وہ عرش پر متمکن ہوا۔ لفظ "عرش" کا استعاراتی مطلب عام طور پر مترجمین بشمول میرے، جو لیتے ہیں وہ سورۂ ہود کی آیت ۷ قبول نہیں کرتی۔ اگر اللہ اپنی مخلوق کی رگِ جاں سے بھی زیادہ اس کے قریب ہے تو پھر فرشتوں کو اس تک پہنچنے کے لیے ایک ہزار سے پچاس ہزار سال کا سفر کیوں طے کرنا پڑتا ہے۔

ان آیات سے متعلق میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ عربی زبان کے لفظ "عرش" کا مطلب عام طور پر اقتدار سمجھا جاتا ہے۔ جب قرآنِ مجید یہ کہتا ہے کہ: "اللہ نے اپنے آپ کو اپنے عرش پر متمکن کیا"، اس کا مطلب یہ ہے کہ

اپنی تمام مخلوق کو کنٹرول کرنے کے بعد اس نے اس کی زمامِ کار سنبھالی۔ قرآن میں یہ آیت عام طور پر اس عقیدے کی نفی کرنے کے لیے آتی ہے جس عقیدے کے حامل یہ کہتے ہیں کہ اگرچہ کائنات میں جو کچھ موجود ہے اس کا خالق اللہ ہے لیکن ہر چیز تخلیق کرنے کے بعد اس کا نظم سنبھالنے کے لیے اختیارات اس نے دوسروں کو سونپ دیے تھے۔ یہ عقیدہ اپنے مفہوم کے اعتبار سے اس عقیدے کے بہت قریب ہے جس کی رو سے یہ بات کہی جاتی ہے کہ خدا (اسباب و علل کے جاری اس سلسلے میں) صرف ''پہلا سبب'' یا ''علت العلل'' ہے۔

میرے نزدیک قرآن کا لفظ ''عرش'' کائنات کے اندر یا باہر اپنے کسی خاص مقام کی طرف اشارہ نہیں کر رہا ہے بلکہ یہ یہاں مذکورہ عقیدے کی نفی کر رہا ہے اور یہ واضح کر رہا ہے کہ اللہ نے نہ صرف یہ کائنات تخلیق کی ہے بلکہ وہ اکیلا اس کے تمام معاملات کو کنٹرول بھی کر رہا ہے۔

اسی طرح قرآن جب یہ کہتا ہے کہ خدا تمھاری رگِ جاں سے بھی زیادہ قریب ہے تو یہ دراصل انسان کو اس حقیقت سے آگاہ کرنا ہے کہ خدا کا علم، علمِ کل ہے۔ اس کا علم ہر شے پر محیط ہے۔ چنانچہ، پوری آیت کے الفاظ اس طرح سے ہیں:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ج وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ. (۵۰:۱۶)	''اور انسان کو ہم نے پیدا کیا ہے اور ہم جانتے ہیں اس کے دل میں جو وسوسے گزرتے ہیں اور ہم اس کی رگِ جاں سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔''

یہ آیت واضح طور پر انسان کے دل میں پیدا ہونے والے خیالات کے بارے میں خدا کے علم سے آگاہ کر رہی ہے۔ سیاقِ کلام اس کی دلیل ہے کہ یہاں خدا کی مادی پوزیشن بتانا مقصود نہیں ہے بلکہ اس کے علمِ کل سے مطلع کرنا پیشِ نظر ہے۔ اسی طرح سورۂ حدید کی آیت ۴ اور سورۂ ق کی آیت ۱۶ کا منشا بھی اللہ تعالیٰ کی جاے مسکن بتانا نہیں ہے بلکہ ایک باطل عقیدے کی نفی کرنا ہے۔ لہٰذا میرے نزدیک یہاں کسی قسم کا باہمی تضاد پیدا نہیں ہوتا۔

۲۔ عرش کا لغوی یا استعاراتی مفہوم

مسٹر کاٹز دوسرا اعتراض یہ کرتے ہیں کہ لفظ ''عرش'' کا خدا کی قوت اور حکومت پر مبنی استعاراتی مفہوم جو عام طور پر بیان کیا جاتا ہے اگر اس کا سورۂ ہود کی آیت ۱۱ کی روشنی میں تجزیہ کریں تو اس مفہوم کو قبول نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے کہ سورۂ ہود کی مذکورہ آیت میں کہا گیا ہے کہ خدا کا عرش پانی پر تھا۔ لفظ ''پانی'' کے استعمال

سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا کا عرش کسی مادی مقام پر موجود ہے۔ چنانچہ اس آیت میں لفظ ''عرش'' کا استعاراتی مفہوم نہیں لیا جا سکتا۔

میں مسٹر کاٹز کی اس بات سے اتفاق نہیں کرتا کہ سورۂ ہود کی مذکورہ آیت خدا کے عرش کے مادی مقام کا بیان ہے۔ میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ سورۂ حدید کی آیت ۴ کی طرح یہاں بھی دراصل اللہ تعالیٰ کے اپنی مخلوقات پر کنٹرول سے مطلع کرنا پیشِ نظر ہے۔ یہاں یہ نہیں بتایا جا رہا کہ کائنات کی تخلیق کے وقت خدا ''کہاں'' موجود تھا بلکہ اس بات سے آگاہ کیا جا رہا ہے کہ اس وقت پوری زمین پانی سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اس لیے اس کا کنٹرول اس وقت پانی پر تھا۔ یہ بات اپنے مفہوم کے اعتبار سے مخلوقات کی ابتدا کے بارے میں بائبل کے بیان کے بہت قریب ہے۔ بائبل کے پہلے باب ''پیدایش'' (Genesis) کا آغاز ہی اس طرح ہوتا ہے:

''خدا نے ابتدا میں زمین و آسمان کو پیدا کیا۔ اور زمین ویران اور سنسان تھی اور گہراؤ کے اوپر اندھیرا تھا اور خدا کی روح پانی کی سطح پر جنبش کرتی تھی[۲]۔'' (۱:۱-۲)

بد قسمتی سے ہمارے پاس بائبل کے اصل الفاظ موجود نہیں ہیں، لیکن ہماری یہ رائے ہے کہ اگر بائبل کے اصل الفاظ موجود ہوتے تو وہ ان الفاظ سے مختلف نہ ہوتے جو مذکورہ مسئلے سے متعلق قرآنِ مجید میں استعمال ہوئے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۳۔ خالق کا کمال اور مخلوق کی کمزوری

مسٹر کاٹز تیسرا اعتراض کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ اگر خدا انسانوں سے ان کی رگِ جاں سے بھی زیادہ قریب ہے تو پھر فرشتوں کو اس کے پاس پہنچنے کے لیے ایک ہزار سے پچاس ہزار سال کا فاصلہ کیوں طے کرنا پڑتا ہے۔

اوپر میں نے جو اپنا نقطۂ نظر بیان کیا ہے اس سے یہ اعتراض آپ سے آپ رفع ہو جانا چاہیے، لیکن اس کے باوجود میں اس کا الگ سے جواب دیتا ہوں جس سے مذکورہ مسئلے کا ایک اور پہلو اجاگر ہو گا۔

میں یہاں اس بات کا اعادہ کروں گا کہ ''رگِ جاں سے بھی زیادہ قریب'' ہونے کا مطلب یہ ہے کہ خدا کا علم ہر شے پر محیط ہے۔ جہاں تک سورۂ معارج کی آیت ۴ کا تعلق ہے تو اس سے دراصل ایک تو یہ بتانا مقصود ہے

۲۔ بائبل کا یہ ترجمہ ''بائبل سوسائٹی'' انارکلی لاہور کی بائبل سے لیا گیا ہے۔ (مترجم)

کہ اللہ تعالیٰ کس قدر عظمت و بزرگی اور جاہ و جلال کی حامل ہستی ہے اور دوسرے یہ کہ اللہ کے کام کرنے کے پیمانوں کی حقیقت انسان اپنی محدودیتوں، معذوریوں اور مجبوریوں کی وجہ سے صحیح اور مکمل طور پر نہیں سمجھ سکتا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے کام کرنے کے وقت کے پیمانے ہمارے وقت کے پیمانوں سے بہت بڑے ہیں۔ ظاہر ہے عالمِ کل ہونا یا بڑی شان والا ہونا، دو الگ الگ چیزیں ہیں جو کسی طرح ایک دوسرے کی نقیض نہیں ہیں۔ مذکورہ دونوں آیات دو مختلف باتیں کر رہی ہیں۔ ایک آیت میں خدا نے انسان سے دراصل یہ کہا ہے کہ میں تمھارے ہر فعل سے آگاہ ہوں اور دوسری آیت میں درحقیقت یہ کہا ہے کہ میرے مقرب سے مقرب فرشتے بھی مجھ تک آسانی سے رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔ ایک آیت میں خدا اپنے علم کا کمال بیان کرتا ہے اور دوسری آیت میں مخلوق کی کمزوری اور اپنی عظمت اور بزرگی کا ذکر کرتا ہے۔ یہ دونوں باتیں کسی طور پر بھی ایک دوسرے کے ساتھ متصادم قرار نہیں دی جا سکتیں۔ لٰہذا میرے نزدیک ان آیات کو باہم متضاد قرار دینے پر مبنی مسٹر کاٹز کا اعتراض بے جا ہے۔

میں امید کرتا ہوں میری توضیحات پر غیر جانبداری کے ساتھ غور کیا جائے گا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

محمد بلال

دانش سرا، پاکستان کا دوسرا سالانہ اجتماع

— ۲ —

جاوید احمد صاحب غامدی کی افتتاحی تقریر کے بعد مسجد میں ۷:۴۵ پر نمازِ عشا ادا کی گئی۔ ۸:۱۸ پر رات کا کھانا کھایا گیا۔ رات ۹:۱۵ پر محاضرات کا پہلا مرحلہ شروع ہوا۔ اس مرحلے کے میزبان سجاد خالد صاحب تھے۔ سجاد خالد صاحب کے تمہیدی کلمات کے بعد طالب محسن صاحب ۹:۲۰ پر اسٹیج پر تشریف لائے اور ''توکل'' کے موضوع پر تقریر کی۔ اس کے بعد محمد رفیع مفتی صاحب نے ''نصرتِ دین کے حوالے سے صحابہ کا کردار'' کے موضوع پر خطاب کیا۔ رفیع صاحب کے خطاب کے بعد پہلے دن کا باقاعدہ پروگرام اختتام پذیر ہو گیا۔

دوسرے دن (۱۳/ مارچ ۱۹۹۹ء بروز ہفتہ) اجتماع گاہ میں قیام کرنے والے احباب نے مسجد میں ۵:۴۰ پر نمازِ فجر ادا کی۔ نماز کے بعد ساجد حمید صاحب نے مسجد ہی میں درسِ قرآن دیا۔ ۸:۰۰ بجے ناشتا کیا گیا۔ ۹:۲۰ پر اجتماع کے باقاعدہ پروگرام کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا۔ دانش سرا کے مختلف شہروں کے حلقوں کے ناظمین سے ان کے کام کی روداد سنی گئی۔ اس ضمن میں دانش سرا، حیدر آباد کے ناظم شوکت علی صاحب، دانش سرا، گوجرانوالہ کے ناظم توصیف احمد خان صاحب، دانش سرا، اسلام آباد کے ناظم محمد یوسف صاحب، دانش سرا، ڈیرہ غازی خاں کے ناظم ڈاکٹر ظفر اعجاز، دانش سرا، لاہور کے ناظم سجاد خالد صاحب اور دانش سرا، کراچی کے ناظم ڈاکٹر آغا طارق سجاد نے اپنے کام کی رفتار، وسعت اور اس کے مسائل کا ذکر کیا۔ اس موقع پر اجتماع کے شرکا نے ان حضرات سے مختلف سوال بھی کیے۔ اگرچہ اوکاڑا میں دانش سرا کا باقاعدہ حلقہ موجود نہیں ہے مگر حقیقت میں وہاں پورا کام ہو رہا ہے۔ چنانچہ اوکاڑا کے علی احمد صاحب کو بھی اسٹیج پر مدعو کیا گیا۔

اس کے بعد حلقے سے متعلق کچھ اہم شخصیات غلام رسول رحمانی صاحب، ندیم اعظم صاحب اور پروفیسر عبدالحمید کو اسٹیج پر مدعو کیا گیا۔ آخر میں معز امجد صاحب اور شہزاد سلیم صاحب کو ان کے انٹرنیٹ پر دینی کام کے حوالے سے اسٹیج پر آنے کی دعوت دی گئی۔ ان حضرات سے اجتماع کے شرکا نے مختلف سوال بھی پوچھے جن کے انھوں نے جواب دیے۔

۱:۳۰ بجے مسجد میں نمازِ ظہر ادا کی گئی۔ نمازِ ظہر کے بعد دوپہر کا کھانا کھایا گیا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد نمازِ عصر تک اجتماع کے شرکا کو باہمی میل جول کا موقع فراہم کیا گیا۔ اس دوران میں لوگ آپس میں بے تکلفانہ ماحول میں بات چیت کرتے رہے۔ ۵:۰۰ بجے چائے پی گئی۔ ۵:۲۰ پر اجتماع کے باقاعدہ پروگرام کے اگلے مرحلے کا آغاز ہوا۔ اب میزبان دانش سرا، کراچی کے ناظم ڈاکٹر آغا طارق سجاد تھے۔ ۵:۱۵ پر طارق سجاد صاحب نے تمہیدی کلمات ادا کیے اور ''احیاے امت کی کوششوں پر ایک نظر'' کے موضوع پر اظہارِ خیال کرنے کے لیے خورشید احمد صاحب ندیم کو دعوت دی ۵:۲۰ پر خورشید صاحب کی تقریر شروع ہوئی اور ۵:۵۲ پر اختتام پذیر ہوئی۔ تقریر کے بعد خورشید صاحب نے شرکا کے مختلف سوالوں کے جواب بھی دیے۔ ۶:۲۰ پر نمازِ مغرب ادا کی گئی۔ نمازِ مغرب کے بعد باقاعدہ پروگرام کا سلسلہ پھر شروع ہوا اور اس میں آصف افتخار صاحب نے ''اسلامی قانون براے معیشت —— چند اہم مباحث'' پر گفتگو کی۔ اس کے بعد ڈاکٹر محمد فاروق خان نے ''پاکستان میں نفاذِ اسلام —— امکانات اور مسائل'' کے موضوع پر تقریر کی۔ ۷:۴۵ پر نماز ادا کی گئی۔ فاروق صاحب کی تقریر اپنے مقررہ وقت پر ختم نہ ہو سکی لہٰذا انھیں دوسرے دن اپنی تقریر مکمل کرنے کے لیے زائد وقت دیا گیا۔

۸:۱۵ پر رات کا کھانا کھایا گیا۔ کھانا کھانے کے بعد باقاعدہ پروگرام کا اگلا مرحلہ شروع ہوا۔ اس مرحلے میں محمد اسلم نجمی صاحب نے ''انسان جرم کیوں کرتا ہے؟'' اور خالد ظہیر صاحب نے ''اہلِ اسلام کی غلط فہمیاں'' کے موضوع پر خطاب کیا۔

۱۰:۰۰ بجے ادبی نشست کا آغاز ہوا۔ محمد انیس مفتی صاحب نے میزبانی کے فرائض انجام دیے۔ سب سے پہلے ضیاء الدین صاحب نعیم کو جو لیاقت پور سے تشریف لائے تھے دعوتِ کلام دی گئی۔ نعیم صاحب نے اپنا حمدیہ کلام سنایا۔ اس کے بعد نعیم احمد بلوچ صاحب نے ''چنگاری سے شعلے تک'' کے عنوان سے ایک افسانہ سنایا۔ پھر لیاقت پور کے سید مستقیم صاحب نے غزل سنائی۔ یاسر مجید صدیقی صاحب نے ایک قطعہ اور ایک نظم

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

بعنوان ''جا تجھے معاف کیا'' پیش کی۔ میں نے ''بیوی اور ماں'' کے عنوان سے افسانہ سنایا۔ ساجد حمید صاحب نے اپنی غزل اور نظم کے مختلف اشعار سنائے۔ سجاد خالد صاحب اور محمد اسلم نجمی صاحب نے قطعہ اور غزل کی اصناف میں اپنا کلام سنایا ۰۰ : ۱۱ بجے ادبی نشست کا اختتام ہوا۔

تیسرے دن (۱۴ مارچ ۱۹۹۹ بروز اتوار) ۴۰ : ۵ پر اجتماع گاہ میں قیام کرنے والے شرکا نے مسجد میں نمازِ فجر ادا کی۔ نمازِ فجر کے بعد مسجد ہی میں یاسر مجید صدیقی صاحب نے درسِ قرآن دیا۔ ۸ بجے کے قریب ناشتا کیا گیا۔ ۳۰ : ۹ پر باقاعدہ پروگرام کا آخری مرحلہ شروع ہوا۔ اس مرحلے کے تین حصے تھے۔ پہلے حصے میں ڈاکٹر محمد فاروق خان نے اپنی نامکمل تقریر مکمل کی اور تقریر کے بعد شرکا کے سوالوں کے جواب دیے۔ ۰۰ : ۱۰ بجے دوسرا حصہ شروع ہوا۔ اس حصے میں جاوید احمد صاحب غامدی نے شرکا کے مختلف سوالوں کے جواب دیے۔ ان میں سے چند سوال و جواب افادۂ قارئین کے لیے اس قسط کے آخر میں پیش کیے جا رہے ہیں۔

کسی بھی پروگرام میں کچھ لوگ اسٹیج پر نمایاں طور پر نظر آتے ہیں لیکن کچھ لوگ خود نمایاں طور پر نظر نہیں آتے لیکن وہ لوگ اتنے اہم ہوتے ہیں کہ جن کے بغیر وہ پروگرام صحیح طور پر مکمل نہیں ہو سکتا۔ اس اجتماع کے انعقاد میں بھی کچھ ایسے لوگ موجود تھے، جنھوں نے اجتماع کے اس خیال کو متشکل کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

منظور الحسن صاحب اس اجتماع کے ناظم تھے۔ انھوں نے ناظمِ اجتماع ہونے کا صحیح معنوں میں حق ادا کیا۔ سجاد خالد صاحب نائب ناظمِ اجتماع تھے۔ منظور صاحب نے انھیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ در حقیقت وہی ناظمِ اجتماع تھے۔ سجاد صاحب نے رفقائے کار سے بڑی محبت سے کام لیا۔ نوید افضل بٹ صاحب ناظمِ طعام تھے۔ وہ اس کے لیے اجتماع سے کئی روز پہلے سرگرم ہو گئے تھے۔ اخراجات کو کم سے کم اور معیار کو بہتر سے بہتر رکھنے کے لیے انھوں نے بے پناہ محنت کی حتیٰ کہ طعام کی تیاری کی نگرانی کی وجہ سے وہ اسٹیج کے پروگراموں میں بھی شریک نہ ہو سکے۔ محمد اکرم صاحب، محمد حفیظ صاحب اور عمران خان صاحب نے ناظمِ طعام کے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ اشفاق عمر صاحب برقیات اور ساؤنڈ سسٹم کے ناظم تھے۔ انھوں نے بہت ذمہ داری سے اپنا کام انجام دیا۔ اجتماع کے دوران میں گھنٹوں بجلی کی سپلائی بند رہی، لیکن انھوں نے جنریٹر کا متبادل انتظام بروے کار لا کر بجلی کے معاملے میں کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہونے دیا۔ انھوں نے اپنی رہنمائی کے لیے اپنے استاد اور معاونت کے لیے دوستوں کو بھی اجتماع میں مسلسل شریک رکھا۔ ان حضرات نے بھی دینی جذبے کے تحت تعاون کیا۔ محمد ادریس صاحب نے پنڈال اور اسٹیج کی ذمہ داری کو نہایت خوبی کے ساتھ نبھایا۔ عمران وحید

صاحب، طاہر مہر دین صاحب اور محمد حنیف صاحب نے ان کے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ وسیم بیگ صاحب، محمد رمضان صاحب، معظم صفدر صاحب اور جاوید اشرف صاحب نے استقبالیہ کی ذمہ داری اچھے طریقے سے ادا کی۔ ناظمِ مکتبہ عقیل انجم صاحب نے منعم صفدر صاحب کے ساتھ مل کر ہماری مطبوعات اور کیسٹوں کی فراہمی کا کام احسن طریقے سے انجام دیا۔ ہمارے حلقے کے ایک ذمہ دار بزرگ اسحاق ناگی صاحب نے سیکورٹی کا بہت اچھا انتظام کیا، جس کی وجہ سے اجتماع کے دوران میں کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ انیس مفتی صاحب کی ذمہ داری مسائل پر نظر رکھنا اور ان کے حل کے لیے فوری تدبیر کرنا تھی۔ عملی کاموں کی اچھی صلاحیت رکھنے کی وجہ سے انھوں نے اپنی ذمہ داری بہت اچھے طریقے سے انجام دی۔ محمد حنیف صاحب جو لاہور کے دور دراز علاقے سے آئے تھے انھوں نے اجتماع گاہ میں بینرز لگانے اور اس نوعیت کے دوسرے کام بڑی تندہی سے انجام دیے۔ ریکارڈنگ پر مامور عابد تیمور صاحب نے بھی اپنا فرض اچھے طریقے سے پورا کیا۔

ان کے علاوہ عبدالرؤف حیدر صاحب، جواد نواز صاحب، لیاقت علی صاحب، ناصر پاشا صاحب، منور حسین صاحب، جواد احسن صاحب، معاذ احسن صاحب، عمر فاروق صاحب، عمیر انیس صاحب، فیصل نقوی صاحب، آصف خلیل صاحب، راشد صاحب، اور متعدد دوسرے افراد کے تعاون نے بھی اجتماع کے انعقاد میں اہم کردار ادا کیا۔ ای بلاک ماڈل ٹاؤن کی جامع مسجد کی انتظامیہ اور خاص طور پر اس انتظامیہ کے ایک رکن چودھری نذیر احمد صاحب نے بہت تعاون کیا۔ حلقہ گوجرانوالہ کے افراد خود کو میزبانوں میں شمار کر کے عملی کاموں میں شریک رہے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام افراد کو جزا دے۔

اب چند سوال و جواب درج کیے جاتے ہیں جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے:

سوال: دانش سرا کے زیرِ اہتمام جو لیکچرز سنائے اور دکھائے جاتے ہیں ان کی طرف لوگوں کی توجہ بہت زیادہ ہے لیکن جو لٹریچر شائع ہوتا ہے اس کو پڑھنے میں لوگوں کی دلچسپی کم ہے۔ اس کی وجہ اس لٹریچر کی مشکل زبان ہے۔ کیا اس لٹریچر کو عام فہم نہیں کیا جا سکتا؟

جواب: جب کسی نئے فکر کی تشکیل کی جا رہی ہوتی ہے تو پہلے مرحلے میں اس کو خالص علمی اور فنی سطح پر پیش کرنا ناگریز ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں زیادہ تر کام ابھی اس نوعیت کا ہوا ہے۔ اگلے مرحلے میں یہی چیزیں عام فہم بھی ہو جائیں گی اور بہت سے ایسے لوگ بھی پیدا ہو جائیں گے جو ان کی عام آدمی کی ذہنی سطح کے مطابق تسہیل کر دیں گے۔ اس کا انتظار کیجیے۔ ایسے کاموں کے لیے ایک خاص وقت بہر حال درکار ہوتا ہے۔ اس کے بعد ایسی

چیزیں ان شاءاللہ کئی سطحوں پر فراہم ہو جائیں گی۔

سوال: حکومت کو غلط کاموں سے روکنے کے لیے ایک موثر پریشر گروپ کی ضرورت ہے۔ کیا آپ اس خیال سے متفق ہیں کہ دانش سرا کی طرف سے ایسی کوشش ہونی چاہیے؟

جواب: دیکھیے بات یہ ہے کہ مختلف ملکوں میں جب جمہوری فضا ہوتی ہے تو سیاسی گروہ وجود میں آتے رہتے ہیں جن کو اصطلاح میں پریشر گروپس کہا جاتا ہے۔ یہ بہت سے لوگوں کے ذوق کا کام ہے اور وہ اس کو کرتے بھی ہیں۔ ایسے کام کو ایک جمہوری ملک میں آئینی حیثیت بھی حاصل ہوتی ہے۔ جو لوگ یہ کام کرنا چاہیں، وہ ضرور کریں۔ ہم نے اپنے آپ کو چند کاموں کے لیے خاص کر لیا ہے۔ اور ان کاموں میں سب سے بنیادی کام وہ دعوت ہے جو اللہ کے پیغمبر پیش کرتے رہے ہیں۔ اس لیے ہم اپنی توجہات کو اسی پر مرتکز رکھتے ہیں۔ اپنے کاموں کا لائحۂ عمل بناتے وقت یہ دیکھتے ہیں کہ ان حدود سے تجاوز نہ کریں جن سے اس دعوت کو نقصان پہنچ سکتا ہو۔ ہمارا کام ایک خاص دائرے کا کام ہے کسی اور چیز کو ہم اس دائرے میں شامل کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں۔

سوال: جماعتوں کے اتحاد کے لیے، حرام و حلال کی حدود زیر بحث آنی چاہییں یا فقہی مسائل؟

جواب: میری سمجھ میں کبھی یہ مسئلہ نہیں آسکا کہ جو لوگ دین کی خدمت کا کوئی کام کر رہے ہیں مثال کے طور پر وہ اصلاح و دعوت، تعلیم و تربیت یا اس نوعیت کا کوئی اور کام کر رہے ہیں ان کو متحد کرنے کی ضرورت کیا ہے۔ اگر آپ تعلیم و تربیت کا کام کرنا چاہتے ہیں اور گلی گلی اسکول کھول دیتے ہیں تو اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ دین کی دعوت کا کام بہر حال اہلِ علم کو کرنا ہے۔ دین کی تعبیر میں اہلِ علم کے مابین اختلافات بھی ہوتے ہیں۔ لوگوں کو جس صاحبِ علم پر اعتماد ہو وہ اس کے پاس چلے جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس معاملے میں لوگوں کو پابند نہیں کیا کہ وہ کسی ایک صاحبِ علم ہی کے ہو کر رہ جائیں۔ ہر صاحبِ علم سے استفادہ کرنا چاہیے۔ آپ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ میں فلاں صاحبِ علم کی بات کو زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔ اور قیامت تک ''زیادہ بہتر'' ہی ہو سکتا ہے۔ اس سے آگے کوئی بات نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ حق کی حتمی حجت تو صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ ان پر نبوت ختم ہو گئی۔ اب یہ کام لوگ اپنے اپنے ذوق اور اپنے اپنے طریقے کے مطابق کریں گے۔ میں نہیں سمجھتا کہ ان کاموں کے لیے کسی نوعیت کے اتحاد کی ضرورت ہے بلکہ جیسے ہی یہ اتحاد کیا جائے گا تو حق کے معاملے میں مداہنت اور منافقت اس میں داخل ہو جائے گی۔ دعوت میں بنیادی

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

بات ہی یہ ہے کہ آپ حق کی سچی شہادت دیں۔ صاف صاف طریقے سے اس کو واضح کریں۔ جب آپ اتحاد کریں گے تو پھر کم سے کم نکات رہ جائیں گے۔ اور اصل حق غائب ہونا شروع ہو جائے گا۔ اس لیے میں ایسے کاموں میں اتحاد کا کبھی حامی نہیں رہا ہوں۔

البتہ جب ملکی سطح پر کوئی سیاسی مطالبہ کیا جائے تو اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اتحاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو لوگ سیاسی مطالبات کے طریقے کے اوپر کام کر رہے ہیں یہ مسئلہ ان کا ہے۔ وہ دیکھیں کہ مطالبہ کن اور کتنے نکات پر مبنی ہے۔ ان نکات پر انھیں متحد ہونا چاہیے۔ جب آپ سیاسی مطالبات لے کر اٹھیں گے تو وہ کام قومی اتفاق رائے کا مطالبہ کرتا ہے یا کم سے کم اکثریت کی تائید کا مطالبہ کرتا ہے۔ وہاں اتحاد کی ضرورت بھی ہوتی ہے اور اتحاد کے فوائد بھی ہوتے ہیں۔ وہاں کم سے کم نکات کو اختیار کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔ لیکن دین کی دعوت، تعلیم اور تربیت، یہ وہ کام ہیں جنھیں آپ جتنے تنوع کے ساتھ انجام دیں، جتنی کھلی فضا میں انجام دیں اور جتنی مختلف ترجیحات کو قائم کر کے انجام دیں، اتنا ہی ان میں حق کا غلبہ رہتا ہے۔

سوال: آپ کے نزدیک اقامتِ دین کا مفہوم کیا ہے؟

جواب: دین کو پوری طرح اختیار کرنا۔ دین کو اس کی روح اور اس کے قالب کے لحاظ سے اختیار کرنا۔ دین کو اپنا لینا۔ یہ مطلب ہے اس کا۔ اقامتِ دین کا مطلب وہی ہے جو اقامتِ صلوٰۃ کا ہے۔ یعنی نماز کو اختیار کرنا۔ نماز کو ادا کرنا۔ سلف خلف ہمیشہ اقامتِ دین کا یہی مطلب لیتے تھے۔ موجودہ زمانے میں لوگوں نے اس سے مختلف مطلب اخذ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ورنہ تمام اہلِ علم اس مطلب پر متفق ہیں جو میں نے آپ کو بتایا۔

سوال: ہر گھر میں ٹی وی موجود ہے۔ اس کے برے اثرات سے کیسے بچا جا سکتا ہے؟

جواب: دیکھیے، یہ ایک ایسی وبا ہے جو پورے معاشرے میں پھیل گئی ہے۔ اس کو اٹھا کر باہر بھی نہیں پھینکا جا سکتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مسئلے کے اپنے کچھ معاشرتی اور سماجی پہلو ہیں جو بڑے خطرناک نتائج تک پہنچا سکتے ہیں۔ جب معاشرے میں ایسی وبا پھیل جائے تو اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ آپ لوگوں کا شعور بلند کریں۔ ان کے اندر خیر کا شعور پیدا کریں۔ ان کے اندر جنت کی طلب پیدا کریں۔ ان کو یہ بتائیں کہ دنیا کی زندگی کیسی عارضی ہے۔ یہ سمجھائیں کہ یہاں نفس کی معمولی لغزش وہاں کتنے بڑے خسارے کا باعث بن جائے گی۔ یہ بتائیں کہ ان کو وہاں بہتر سے بہتر مقام حاصل کرنے کے لیے یہاں اپنے آپ کو پاک رکھنا ہے۔ یہ چیز آپ بتائیں گے تو شعور پیدا ہو گا۔ اور جب شعور پیدا ہو گا تو آہستہ آہستہ یہ چیزیں بے معنی ہو جائیں گی۔

جب کوئی چیز اس درجے میں عام نہ ہوئی ہو تو اس وقت تک اس پر کوئی پابندی لگا کر اس کے ضرر کا ازالہ کیا جا سکتا ہے۔ موجودہ زمانے میں میڈیا نے جو صورت اختیار کر لی ہے۔ اس میں پابندی کا رویہ شاید ممکن ہی نہیں۔ پابندی لگائی گئی تو ہزار چور دروازے نکل آئیں گے۔ اس یلغار کا مقابلہ نفسِ انسانی کی اصلاح سے ہو گا، پابندی سے نہیں۔

سوال: شریعت کی رو سے کسی گروہ کو کافر قرار دیا جا سکتا ہے؟

جواب: شریعت میں کسی کو کافر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اسلامی ریاست بھی کسی کی تکفیر نہیں کر سکتی۔ البتہ وہ زیادہ سے زیادہ سورۂ توبہ کی آیت ۵ میں بیان کردہ شرائط سے انحراف کے نتیجے میں کسی گروہ کو غیر مسلم قرار دے سکتی ہے۔

کافر کا مطلب تو دین کی اصطلاح میں یہ ہے کہ کسی گروہ کے بارے میں اللہ کی حجت پوری ہو گئی اور یہ بات واضح ہو گئی کہ اس نے ضد، عناد اور ہٹ دھرمی کی بنیاد پر دین کا انکار کیا۔ اس گروہ کو کافر کہا جاتا ہے۔ یہ چیز پیغمبروں اور صحابۂ کرام کے بعد اب میری اور آپ کی سعی سے ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ اس لیے تکفیر کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ اس کی کبھی جسارت نہیں کرنی چاہیے۔

البتہ کوئی چیز کفر ہے، کوئی چیز شرک ہے، کوئی چیز بدعت ہے، اس کے بارے میں توجہ بھی دلانی چاہیے، حکمت کے ساتھ نصیحت بھی کرنی چاہیے۔ اس سے زیادہ ہماری کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

(جاری)

افسانہ

محمد بلال

شکایت

جمیلہ کی شادی ہوئی۔ کچھ دنوں بعد وہ میکے آئی۔ اپنی بہنوں اور سہیلیوں سے ملی۔ انھوں نے اس سے پوچھا:

''دولہا بھائی کیسے آدمی ہیں؟

جمیلہ کے چہرے پر شرم کی لالی ابھری۔ وہ اپنی مسکراہٹ روکتے ہوئے بولی:

''اچھے ہیں۔''

پھر اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ اس کے چہرے کی لالی میں ہلکی سی سیاہی کی آمیزش ہوئی۔ اس نے برا سا منہ بنا کر کہا:

''لیکن ہر وقت اپنی ماں کے مرید ہی بنے رہتے ہیں۔ ہر کام اس سے پوچھ کر کرتے ہیں۔ میں نے کہا: گھر میں گیزر لگوا لیں، تو بولے: ماں جی سے بات کروں گا۔ میں نے کہا: کسی باغ میں سیر کرنے چلیں، تو بولے: ماں جی سے بات کرتے ہیں، اجازت ملی تو ضرور چلیں گے......۔''

ایک سہیلی بولی:

''معلوم ہوتا ہے وہ اپنی ماں سے شدید محبت کرتے ہیں۔''

یہ بات سن کر جمیلہ نے اس سہیلی کو ترچھی نظر سے دیکھا۔ پھر اس کی ناک سے تیزی سے 'ہوں' کی آواز نکلی اور اس نے اپنا سر جھٹک کر دوسری طرف کر لیا۔

دو سال کے بعد جمیلہ کے گھر لڑکا پیدا ہوا..... لڑکا جوان ہو گیا۔

ادھر وقت نے جمیلہ کے خاوند پر کوئی اثر نہ کیا۔ اس کا اپنی ماں کے ساتھ تعلق اسی طرح قائم رہا۔ جمیلہ بھی ویسی کی ویسی ہی رہی۔ جب بھی وہ میکے جاتی یا اس کی کوئی سہیلی اسے ملنے آتی تو وہ اپنے شوہر کے اس کی ماں کے ساتھ تعلق پر ضرور شکوہ شکایت کرتی۔ اسے سب سے زیادہ اس بات پر شکوہ رہتا تھا کہ وہ اپنی ساری تنخواہ اپنی

ماں کے ہاتھ پہ کیوں رکھ دیتے ہیں۔

وقت کا پہیا چلتا رہا۔ ایک دن جمیلہ کے لڑکے کی شادی ہو گئی۔

وہ لڑکا بچپن سے اپنی ماں کا شکوہ شکایت سن رہا تھا۔ وہ بیوی کے حقوق کے معاملے میں بہت حساس ہو چکا تھا۔ چنانچہ وہ اپنی بیوی کا بہت خیال رکھتا تھا۔ وہ اسے بالکل اسی طرح چاہتا تھا جس طرح جمیلہ بیوی کی حیثیت سے چاہتی تھی کہ اسے چاہا جائے۔ ایک دفعہ اس کی بیوی نے اپنے کمرے میں اے سی لگوانے کی بات کی، اس نے اسی وقت ہامی بھر لی۔ وہ کبھی باہر کھانا کھانے کی خواہش ظاہر کرتی، وہ ہنسی خوشی مان جاتا۔ حتیٰ کہ چند ماہ بعد اس نے تنخواہ بھی بیوی کو دینا شروع کر دی۔

وقت کا دریا اسی طرح بہتا رہا۔

ایک دن جمیلہ اپنے گھر کے صحن میں چہرہ لٹکا کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا لڑکا اپنی بیوی کے ساتھ باہر کھانا کھانے گیا ہوا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ معلوم ہوا جمیلہ کی ایک پرانی سہیلی اسے ملنے آئی ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے بڑی گرم جوشی سے ملیں۔ پھر وہ باتیں کرنے لگیں۔ باتوں باتوں میں جمیلہ کے لڑکے کا ذکر آ گیا۔ جمیلہ غمگین ہو گئی۔ اس کے ماتھے پر بہت سی شکنیں ابھر آئیں۔ وہ برا سا منہ بنا کر بولی:

''وہ تو ہر وقت اپنی بیوی کا مرید ہی بنا رہتا ہے۔ اس کی ہر خواہش پوری کرتا ہے۔ تنخواہ بھی ساری اس کے ہاتھ پہ رکھ دیتا ہے۔''

سہیلی نے کہا:

''معلوم ہوتا ہے وہ اپنی بیوی سے شدید محبت کرتا ہے۔''

یہ بات سن کر جمیلہ نے اس سہیلی کو ترچھی نظر سے دیکھا۔ پھر اس کی ناک سے تیزی سے 'ہوں' کی آواز نکلی اور اس نے اپنا سر جھٹک کر دوسری طرف کر لیا۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

خیال و خامہ

جاوید

جرمِ ضعیفی

[المیۂ کوسووا پر لکھی گئی]

اِس شاخ پہ کژدم ہیں تو اُس شاخ پہ اژدر
بیٹھے ہیں کہ محرومِ نشیمن ہوں پرندے
باقی ہے کوئی داد نہ فریاد کی صورت
بستی میں نکل آئے ہیں جنگل سے درندے

اترے ہیں جہنم سے کہ ماؤں نے جنے ہیں
یہ سرب ہیں یا روم کے جلاد سپاہی
انساں ہیں کہ صحرا میں شبِ تار کی وحشت
آدم ہیں کہ ابلیس کے چہرے کی سیاہی

غرناطہ و بغداد میں پہلے بھی، مسلماں
دیکھی ہے یہی جرمِ ضعیفی کی مکافات
افلاک بھی سنتے نہیں بے ہمت مرداں
ہو ضربِ کلیمی تو اتر سکتی ہیں آیات

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

اِس دور میں ہمت کی بنا علم و ہنر ہے
ورنہ یہ تری خاک میں پوشیدہ شرر ہے

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com